تذکرہ
حسینؒ بن منصورؒ حلاج
ڈاکٹر شاہد مختار

میں نے ادیان کے بارے میں گہرے تفکر میں تحقیق کی
اور انہیں کئی شاخوں والی جڑوں کی طرح پایا
کسی سے اس کے دین کے بارے میں مت پوچھو
(ایسا کرنا) اسے جڑ سے جدا کر دیتا ہے
اصل اسے ڈھونڈ لے گا
جیسے جیسے معنی آشکار ہوں گے' وہ جان لے گا

(حسین بن منصور حلاج)

فہرست

دیباچہ

تاریخ تصوف میں حسین بن منصور حلاج کے بارے میں متضاد رائے موجود ہیں۔ ابوعبدالرحمٰن السلمی اور ابن تقطقی کے مطابق اکثر مشائخ کا خیال ہے کہ ان کا تصوف میں کوئی مقام نہیں لیکن اکثر اہل علم انہیں عالم ربانی قرار دیتے ہیں۔

عریب بن سعد قرطبی' ابن ندیم' ابوبکر الصولی' ابوعلی ابن مسکویہ اور عمرو بن عثمان نے اپنی اپنی تصنیفات میں حسین بن منصور حلاج کو ایک جاہل' شعبدہ باز' گمراہ اور خبیث آدمی لکھا ہے جبکہ جوزی لکھتے ہیں کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے اور جنات ان کے قبضہ میں تھے۔ ابونصر سراج نے ہربار ان کے نام کے ساتھ ؒ اور ابوعبداللہ خفیف نے انہیں عالم ربانی قرار دیا ہے۔ ابوبکر شبلی کے مطابق وہ اور حلاج ایک ہی چیز ہیں ان کے جنون نے انہیں مخلصی دلا دی اور حلاج کی عقل نے انہیں ہلاک کر ڈالا۔ ابن عطا کہتے ہیں کہ وہ حلاج کی طرح خدائے یکتا کے ساتھ صوفیانہ وصال رکھتے ہیں اور یہ امر ہر طرح کی بزرگی اور عظمت کا مظہر ہے۔ ابن حاقل کے مطابق حلاج نداف اور زہد و تصوف کے مدعی تھے۔ ابوالعباس بن عطا کہتے ہیں کہ وہ طریق تصوف میں حسن عبارت سے معمور تھے۔ محمد بن علی کتانی کہتے ہیں کہ حلاج کو کثرت ریاضت اور شدت مجاہدات کی وجہ سے اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ وہ اپنے لباس پر دھیان دیں۔ ابوبکر ابن ابی اسحاق کے مطابق وہ قائم اللیل تھے اور انہوں نے کبھی کسی ایسی چیز کی طلب نہیں کی جو ان کے پاس نہ ہوتی تھی۔ امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حلاج ایک سال تک مسجد الحرام میں مشغول عبادت رہے وہ گرمیوں میں جبل ابوقبیس کے تپتے ہوئے پتھروں پر بیٹھے رہتے' شبانہ روز ایک قرص کا کچھ حصہ کھاتے اور صرف دو گھونٹ پانی پیتے تھے۔ شیخ فرید الدین عطار لکھتے ہیں کہ حلاج سوز و اشتیاق میں ڈوبے ہوئے اور آتش فراق کی شدت میں بے قرار تھے۔ وہ شوریدہ روزگار' صادق' پاکباز عاشق' عظیم جدوجہد کے مالک' حیران کن ریاضت و کرامت کے حامل' عالی

ہمت' رفیع قدر اور زیبا سخن تھے۔ داتا ہجویری لکھتے ہیں کہ حلاج طریقت کے مستوں اور مشتاقوں میں تھے اور انہوں نے ابتدائے نمود میں حلاج سے براہین کے ضمن میں قوت حاصل کی تھی۔ امام غزالی لکھتے ہیں کہ الوہی حسن نے حلاج کو نعرہ اناء الحق کے لیے اکسایا تھا۔ مولانا رومی کے مطابق حلاج عارف کامل اور ان کا نعرہ اناء الحق جائز تھا۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ حسین بن منصور حلاج کا نعرہ اناء الحق تخلیقی صداقت ہے اور سلیمان ندوی کی نظر میں حلاج قتیل سیاست تھے۔

یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں تصوف صرف میلانات اور رجحانات تک محدود رہا اور سیاست روحانی فلسفے کی بجائے دنیاوی راستے پر گامزن رہی۔ تیسری صدی میں صوفیوں نے اسلام اور دوسرے مذاہب سے استفادہ کرتے ہوئے الہیات کا اپنا نظام قائم کرنے کی کوشش کی اور حکومت سے بے تعلقی کی بنا پر زیر عتاب ٹھہرے۔ اس دور میں تصوف میں معروف کرخی' ذوالنون مصری اور حسین بن منصور کے زیر اثر فنا' توحید' حال' مقام' اتحاد اور رجعت وغیرہ کی اصلاحات مروج ہوئیں اور عشق اور علم باطن پر زور دیا گیا۔ اسی دور میں سری سقطی اور معروف کرخی کے فلسفہ توحید کا پرچار ہوا' بایزید .سطامی نے "میں حق ہوں" اور "میں ہی وحدۃ الوجود ہوں" کا نعرہ لگایا اور حلاج کے نعرہ اناء الحق نے شہرت حاصل کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سری سقطی اور معروف کرخی کے فلسفہ توحید نے بعد میں وحدۃ الوجود کی شکل اختیار کی' اور یہ نظریہ جس کی رو سے تمام موجودات ذات واحد کے ظہور کی عملی شکل ہیں کی ابتدا تیسری صدی ہجری کے آخر میں حسین بن منصور حلاج کے زمانے سے ہوئی جسے ساتویں ہجری میں محی الدین ابن عربی نے کمال تک پہنچایا۔

حسین بن منصور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اتحاد و حلول جس کی رو سے "ساری مخلوق ایک ہی وجود کا حصہ ہے اور ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے گی" کے قائل تھے۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ یہ نظریہ زرتشت اور بدھ مت کی تعلیمات سے ماخوذ ہے اور شیعوں نے حلول اور الوہیت آئمہ کے نظریات زرتشیوں سے متاثر ہو کر اپنائے

تھے۔ شیعہ مورخین کے مطابق ابتدائی شیعوں میں جنہیں غالی شیعہ کہا جاتا ہے یہ نظریات بدرجہ اتم موجود تھے اور تاریخ گواہ ہے کہ حسین بن منصور حلاج کو پھانسی تک پہنچانے میں حکومتی دربار میں موجود غالی شیعوں نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

دراصل جب تصوف کا فلسفیانہ نظام مرتب ہونے لگا تو حکومت وقت جو بنو امیہ کے آخری اور بنو عباس کے ابتدائی عہد تک روحانی فلسفے سے زیادہ دنیاداری کی واضع ترین علامت بن چکی تھی نے صوفیوں میں حکومت سے بے تعلقی کے بنیادی عنصر کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور شریعت اور طریقت کے درمیان خلیج پیدا کی۔ اس دور میں متمول اور غریب عرب اور غیر عرب کے امتیازات پیدا ہوئے اور طبقہ وارانہ فسادات نے جنم لیا۔ اس کشمکش میں صوفیوں کو جو زیادہ تر متوسط اور غریب طبقہ سے تعلق رکھتے تھے کو مجوسی النسل' قرامطہ کا ایجنٹ یا حکومت کا باغی قرار دیا اور اسلامی ممالک میں شریعت کے ظاہرہ ضوابط کے ٹکراؤ کی پاداش میں انہیں عبرتناک سزائیں دی گئیں۔ ان کی زبانوں پر تالے لگائے گئے۔ سربازار کوڑے مارے گئے۔ انہیں ننگی پیٹھ کے بل بازاروں میں گھسیٹا گیا۔ ان کی خانقاہیں ویران کر دی گئیں اور انہیں قید و بند کی سزائیں سنائی گئیں۔ حسین بن منصور کے نظریات میں چونکہ شریعت اور اس کے شعائر کی طرف جھکنے سے زیادہ طریقت کو شریعت سے بلند تر قرار دینا نمایاں تھا اس لیے شریعت کی مدد سے حکومت نے انہیں تختہ دار پر لٹکا دیا۔

آیئے اس پراسرار ہستی کی سربستہ راز حیات کے شب و روز پر جمی ہوئی روایات کی دبیز تہہ کو تاریخی شواہد کی مدد سے صاف کرتے ہوئے تصوف کی دنیا کو نعرہ اناء الحق سے لرزا دینے والی اس شخصیت کے بارے میں قطعی رائے قائم کریں۔

ڈاکٹر شاھد مختار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیدائش سے بلوغت تک

ہم ان دو روحوں کی مانند ہیں جنہوں نے ایک بدن میں سما کر ایکتا کرلی ہو۔

جب وہ مجھے دیکھتا ہے میں اسے دیکھتا ہوں۔
میں اسے دیکھوں تو وہ مجھے تکتا ہے۔
میرے انگ انگ میں پھیلی نسوں میں بہتے لہو کے ساتھ وہ جاری و ساری ہے۔
ان آنسوؤں کی مانند جو میری آنکھوں سے بہہ رہے ہیں۔
ضمیر قلب میں یوں سما گیا ہے
روح بدن میں جذب ہو جیسے۔
اے اللہ تیری روح اور میری روح یوں اکٹھی ہوگئی ہیں جیسے آب زلال میں شراب۔
جب کسی شے کا لمس تجھے محسوس ہوتا ہے تو اس لمس کا احساس مجھے بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ تو اور میں ایک ہی تو ہیں۔ ہر حال میں ایک رہنے والے۔

یہ جرات مندانہ اظہار خیال کرنے والی بے باک ذات المغیث الحسین بن منصور حلاج تھی جسے دنیا ان کے اپنے نام حسین سے زیادہ ان کے باپ منصور کے نام سے جانتی ہے۔ اس بے باک انسان کو بقائے دوام اور شہرت عام اس کے لگائے گئے نعرہ اناالحق کی وجہ سے نصیب ہوئی۔ ابن منصور ایرانی النسل صوفی' عربی زبان کے شاعر اور صاحب سکر

تھے۔ وہ دنیاوی طور پر قلاش اور ایک گوشہ نشین صومعہ میں رہنے والے بے ضرر انسان
تھے جن کے عقائد شدید اور مطالبات شدید تر تھے۔ ان کے نزدیک عشق حقیقی یوم محشر
اور عشق کا نامحرم' مردہ ہے۔ وہ تمام عمر جستجوئے زندگی کے صحرا میں پیاسے اور جاں بلب
انسان کی طرح بھاگتے رہے اور اپنی مضطرب روح کو عشق خداوندی میں جلاتے رہے۔ ان
کے بیٹے احمد بن حسین بن منصور حلاج سے روایت ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے دلوں کی
باتیں بتلاتے اور اسرار حال بیان کرتے رہتے تھے اس لیے اہواز کے لوگ انہیں حلاج
الاسرار کہتے تھے۔ وہ دعوت حق کے لیے فارس' ہندوستان' چین' ترکستان' خراسان اور
ماوراء النہر بھی گئے۔ ان ممالک کے لوگ انہیں مختلف ناموں سے خط لکھا کرتے تھے۔ وہ
فارس میں ابوعبداللہ زاہد' ہندوستان میں مغیث' ماچین اور ترکستان میں مقیت' خراسان
میں ممیز اور بغداد میں مصطلم اور محیر کے ناموں سے مشہور تھے۔ ایک روایت کے مطابق
وہ صحابی رسول علی ابو تراب ؓ کی اولاد میں سے تھے جبکہ دوسری روایت کے مطابق ان کا دادا
آتش پرست تھا۔

ابن منصور کے دادا کا نام محمی تھا جو ایک آزاد خیال آتش پرست تھا۔ بیضا میں
سرائے چلانے کے علاوہ چندلیسابور کے مدرسے میں فلسفہ لاہوت کی درس و تدریس کے
کام میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اسے معتزلہ فرقہ کے عقائد سے ہمدردی تھی اور وہ علم الکلام کا
طالب علم تھا۔ حسین کا باپ منصور بھی چندلیسابور کے مدرسے کا طالب علم تھا اور اپنے
آبائی مذہب سے تائب ہو کر اسلام قبول کرچکا تھا۔ وہ علم الکلام کے عام ہونے کے باعث
بیدار ہونے والے فتنوں سے الگ تھلگ اپنی دنیا میں مست ریشم کے کیڑے پالنے اور
ریشمی کپڑا بننے کا کام کرتا تھا لوگ اس کام میں منصور کے نام کو ایک سند سمجھتے تھے۔ باپ
کی وفات کے بعد اس نے سرائے کا کام بھی سنبھال رکھا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادا مسلمان
تھا۔ اس نے عمر کا ایک بڑا حصہ تحصیل علم دینی میں گزارا تھا۔ وہ باطن میں اترنے اور
اسلاف سے سند پانے کو کسی قول کی صحت سمجھتا تھا اور اس سلسلہ میں اسلاف کی اتباع
کرتا تھا۔ اسے سیر اسماء کا شوق اور اسی باعث اساطیر الاولین پر مکمل یقین رکھتا تھا۔ اس نے

معتزلہ کے مختلف فرقوں اور عقائد کا مطالعہ بھی کر رکھا تھا۔

حسین بن منصور کی جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مؤلف
الفہرست ابن ندیم لکھتے ہیں کہ ان کے مؤلد و منشا کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی
بات نہیں کہی جاسکتی۔ ان کے خیال میں وہ نیشاپور' مرو' طالقان' رے یا کوہستان میں سے
کسی ایک جگہ کے رہنے والے تھے جبکہ ابن حوقل' ابوبکر احمد بن علی الخطیب' مسعودی'
ابن جوزی' ابن کثیر اور احمد بن حسین بن منصور کے مطابق وہ بیضا کے رہنے والے تھے جو
طور میں واقع ہے اور انہوں نے' تستر جو اتابک کی وسیع سرزمین کے سرے پر واقع ہے'
کے مقام پر پرورش پائی۔ مشہور فرانسیسی محقق ماسینیون (1865-1962ء) جنکا منصور حلاج
کی زندگی اور افکار پر تحقیقی کام سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے وہ اپنے 24- مئی 1922ء کو
ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کردہ مقالہ Passion میں حسین بن منصور کے حالات زندگی بیان
کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "حلاج کا پورا نام المغیث الحسین بن منصور بن محمی تھا وہ 857ء
میں شہر الصطفر (فارس) میں البیضا کے شمال مشرق میں واقع بمقام طور پیدا ہوئے۔ ایک
روایت کے مطابق ان کا دادا آتش پرست تھا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ایک اصحابی ابو تراب ؓ
کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے والد پیشے کے اعتبار سے دھنیا تھے اور اسی بنا پر ان کی نسبت
حلاج ہوئی کیونکہ عربی زبان میں اس لفظ کے یہی معنی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عربی
زبان میں حلج کے معنی بادل کا چمکنا اور بات کا سینے میں کھٹکنا بھی ہے۔ لہٰذا انہیں اسی نسبت
سے احلج حقہ' یعنی اس نے حق پالیا کہا جاتا ہے۔ ماسینون لکھتا ہے۔ ان کے والد اپنے آبائی
شہر کو خیرباد کہہ کر اس علاقے کی جانب ہجرت کر گئے جو تستر سے (دریائے فرات پر) واسط
تک پھیلا ہوا ہے۔ بظاہر اس نقل مکانی کی وجہ معلوم نہیں لیکن یہ امر قرین قیاس ہے کہ
اس کا سبب تلاش روزگار ہوگا کیونکہ ان کے والد نے جس علاقہ میں سکونت اختیار کی وہاں
ان دنوں پارچہ بافی کی صنعت بڑے عروج پر تھی لیکن شیخ فرید الدین عطار ؒ (م 1240ء)
جو تصوف کے اسرار و رموز سے مخمور تھے اپنی تصنیف تذکرۃ اولالیا میں حلاج کی وجہ تسمیہ
کچھ اور بتائی ہے وہ لکھتے ہیں کہ "ایک مرتبہ حسین بن منصور نے کپاس کے ایک ڈھیر کی

طرف اشارہ کیا جس سے فوراً ہی بنولہ کپاس سے الگ ہوگیا لہٰذا اس کرامت کے باعث انہیں حلاج کہا جانے لگا۔" ان کے مطابق ابن منصور کے والد دھنیا نہیں تھے بلکہ یہ پیشہ ان کے دوست کا تھا۔ ابوعبدالرحمٰن محمد بن حسین السلمی (م 1027ء) جو متقدمین صوفیا میں ایک معتبر نام جانا جاتا ہے اور جن کی تصوف پر گہری چھاپ نظر آتی ہے طبقات الصوفیہ میں لفظ حلاج کے بارے میں روایت بیان کرتے ہیں کہ "حسین بن منصور واسط میں ایک دھنیا کے پاس گئے اور اس کو اپنے ایک کام کے لیے کہیں بھیجنا چاہا۔ دکاندار نے جب مصروفیت کا بہانہ بنایا تو آپ نے اسے کہا کہ تم میرے کام کے لیے جاؤ میں تمہارا کام کرتا ہوں۔ دکاندار جب واپس لوٹا تو اسکی تمام روئی دھنی ہوئی تھی۔"

اس واقعہ کو اس طرح بھی بیان کیا جاتا ہے۔ کہ "واسطہ کے شہر میں ایک روئی کی دوکان تھی جس کا مالک دکان کے دروازے کے باہر بے قراری سے چکر لگا رہا تھا اس کی اس اضطراری کیفیت سے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ کہیں جانا چاہ رہا ہے لیکن خود کو آمادہ نہیں کرپاتا۔ اچانک اس کی نظر شہر کے واحد' اپنی ذات میں گم سم رہنے والے حسین بن منصور پر پڑی۔ اس نے حسین کو بلا کر کہا کہ مجھے ایک بہت ضروری کام کی غرض سے باہر جانا ہے لیکن دکان کو اکیلا چھوڑ کر جاتے وقت خوف محسوس ہو رہا ہے۔ حسین نے بے نیازی سے جواب دیا کہ تم اطمینان سے اپنے کام پر جاؤ میں اس وقت تک تمہاری دکان کی رکھوالی کرتا رہوں گا جب تک تم واپس نہیں آجاتے۔ دکاندار زیرِ لب بڑبڑایا اور کہنے لگا کہ وہ گاہک یقیناً پریشان ہوں گے جن کا کام بروقت نہیں ہوگا لیکن اگر میں اس کام کے لیے نہیں جاتا تو تب بھی غیر معمولی نقصان کا احتمال ہے۔ بہرحال وہ حسین بن منصور کو دکان پر بٹھا کر چلا گیا۔ دکاندار جلد ہی اپنا کام مکمل کرکے واپس آگیا۔ وہ جب دکان میں داخل ہوا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ سامنے حسین بن منصور روئی کے ساتھ انہونا سلوک کر رہے تھے۔ وہ اپنی پراسرار آواز میں روئی سے بنولہ کو الگ ہونے کا حکم دے رہا تھا اور یہ مسحور انگیز دلکش منظر دکاندار کی نگاہوں کے سامنے تھا کہ روئی اور بنولے الگ الگ جگہ پر ڈھیر ہوتے جا رہے تھے۔ دکاندار یہ منظر دیکھ کر تاب نہ لاسکا اور حسین بن منصور سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے اور یہ سب کیسے ہو رہا ہے۔ حسین نے پیچھے مڑ کر جب دکاندار کو حیران دیکھا تو کہا کہ آپ جاتے خود ہی تو کہہ رہے تھے کہ اگر مجھے روئی دھنکنے کا موقعہ نہ ملا تو گاہک آکر تنگ کریں گے سو میں نے سوچا کہ آپ کو اس پریشانی سے نجات دلا دوں اور پھر یہ کون سا مشکل اور مشقت طلب کام تھا جو نہیں ہوسکتا تھا۔ دکاندار نے کہا کہ یہ تو جادو ہے اور کیا تم جادو جانتے ہو۔ حسین نے جواب دیا نہیں' اسے جادو نہیں کہتے میں تو اسی کوشش میں سرگرداں ہوں کہ جس طرح روئی کے اس ڈھیر سے روئی اور بنولہ علیحدگی اختیار کرتے جا رہے ہیں اسی طرح میں بھی اپنی ذات سے دوئی کو یکمشت علیحدہ کردوں کاش مجھ سے یہ ہوسکتا' میں یہ کرسکتا۔ دکاندار نے کہا حسین تم واقعی حلاج ہو اور آئندہ میں تمہیں اسی نام سے پکارا کروں گا۔"

ابن منصور کے متعلق مشہور تھا کہ وہ واسط میں ہم عمر لڑکوں سے علیحدہ' خاموش اور چپ چاپ رہتا تھا۔ وہ نہ ہنستا تھا' نہ بولتا تھا' نہ سوتا تھا اور نہ ہی بیٹھتا تھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی ذات میں گم رہتا تھا اور اس کے چہرے پر بیقراری رہتی تھی۔ لوگ اس کے اس حال پر ہنستے اور اسے دیوانہ کہتے لیکن وہ لوگوں کی ان باتوں سے بے نیاز اور لاتعلق رہتا۔ اسے نہ تو لوگوں کی ان باتوں پر غصہ آتا اور نہ ہی وہ ان باتوں کا کوئی جواب دیتا تھا لیکن جب اس کی متذکرہ کرامت کی شہرت شہر میں پھیلی تو وہ لوگ جو پہلے اس گم سم ذات کو دیوانہ کہتے تھے اس کی طرف راغب ہونے لگے جس سے وہ اور بھی بے چین ہوگیا۔ جب اس بات کا علم ان کے والد کو ہوا تو انہوں نے اسے تستر میں مدرسہ دارالحفاظ میں داخل کرا دیا جہاں انہوں نے قرآن شریف حفظ کیا لیکن حسین کی روح بے چین تھی۔ زاہد و پارسا انہیں پسند نہ تھے ہم سبقوں سے ان کا جھگڑا ہو جاتا تھا' استادوں کی وہ غلطیاں پکڑنے لگتے تھے اور درس کے لیے جو فضا ضروری ہوتی تھی اسے درہم برہم کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ ایک استاد نے سرزنش کرتے ہوئے جلتی ہوئی لکڑی ان کی پیشانی میں داغ دی۔ حسین بن منصور سے جب بھی اس داغ کے متعلق کسی نے دریافت کیا تو وہ کہتے تھے کہ میری پیشانی پر یہ داغ "داغِ دلربائی" ہے اور یہی داغ بعد میں ان کی گرفتاری کے وقت ان کی پہچان کی علامت بنا۔

تحصیل علم

ڈاکٹر ماسینیون کی تحقیق کے مطابق حسین بن منصور نے 873ء میں قرآن مجید حفظ کیا اور اس کے بعد دو سال تک تستر میں سہل بن عبداللہ تستری کے مدرسہ تصوف سے منسلک رہے تاکہ اندر کی شوریدگی کو کم کرسکیں۔ یہی بزرگ ان کے سب سے پہلے پیر طریقت تھے۔ اس دور میں علم حدیث' فقہ' تفسیر' ادبیات' تاریخ' تصوف اور علم کلام فلسفہ کا دور دورہ تھا لیکن حلاج نے عربی ادب' علوم مقد اولہ اور تصوف میں دسترس حاصل کی انہیں تصوف سے خاص لگاؤ تھا۔ اس مدرسہ میں ان کی بے قرار طبیعت کو چین نہ آیا اور وہ بغیر اجازت حاصل کئے اس درسگاہ کو چھوڑ کر پیر حسن بصریؒ کے مدرسہ میں چلے گئے اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ تذکرۃ الاولیا میں لکھتے ہیں کہ شروع میں حسین بن منصور تستر کے مقام پر شیخ سہل بن عبداللہ کی خدمت میں پہنچے۔ دو سال تک ان کے ہاں رہے اور پھر عازم بغداد ہوئے۔ سید علی بن عثمان ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ ابتدا میں وہ سہل بن عبداللہ کے مرید تھے مگر بے دستور ان سے الگ ہو کر عمرو بن عثمان المکی کے پاس چلے گئے۔

ابو محمد سہل بن عبداللہ تستری (م 896ء) حنفی مسلک رکھتے تھے۔ وہ ذوالنون مصریؒ (م 858ء) کے مرید تھے اور عراق کے صوفیا میں بلند مقام رکھتے تھے۔ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ وہ مقتدائے صوفیا میں سے تھے آپ کا قول ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے "الست بربکم" فرمایا تھا تو مجھے اپنا جواب بلی اب بھی یاد ہے وہ فرماتے تھے کہ میں ازل سے لے کر آج تک عرش کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ وہ سلسلہ سہلیہ کے موسس تھے۔ وہ اجتہاد اور مجاہدہ نفس پر خاص طور پر زور دیتے تھے۔ ان کا قول ہے کہ "جس وجد و حال پر کتاب و سنت گواہ نہ ہوں وہ باطل ہے۔" وہ زاہد طریقت تھے' بے ریا اور بے عیب تھے جو کچھ پا چکے تھے اس کا چرچا نہیں کرتے تھے۔ کم گو تھے۔ دروس میں شرکت فرماتے تو رواں رہنے والے شاگردوں کو سر کے اشارے سے صحیح اور غلط کی نشاندہی کرتے مگر

وارفتگی' دیوانگی اور گم رہنے کی جگہ بیدار اور ہوشیار تھے۔ شب بیداری اور فاقہ کشی میں رہتے۔ ہمیشہ جو کی روٹی سے روزہ افطار کرتے۔ تین یا پانچ شبانہ روزہ کثرت سے رکھتے۔ نفس کو سخت سزائیں دیتے اور کڑی ریاضتیں کرتے تھے۔ نہ دیوار سے ٹیک لگاتے' نہ پاؤں پھیلاتے اور نہ کبھی کسی غیر کے سوال کا جواب دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ نفس کی مخالفت تمام عبادتوں کا سرچشمہ ہے' نفس کو نہ پہچاننا اپنے آپ کو نہ پہچاننا ہے۔ جو شخص خود کو نہیں پہچانتا وہ خدا کو نہیں پہچان سکتا۔ نفس کا فنا ہو جانا حق کے بقا کی علامت ہے اور نفس کی پیروی حق عزوجل کی مخالفت ہے۔ نفس پر جبر کرنا جہاد اکبر ہے اور مجاہدہ نفس دراصل مشاہدہ کی علت ہے۔ ابو طلحہ مالک سے روایت ہے کہ آپ حالت صوم میں دنیا کے اندر تشریف لائے اور روزے ہی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ سہل بن عبداللہ کا قول ہے کہ فقراء کو نظر تحقیر سے مت دیکھو کیونکہ ان میں اکثر نائب اور وارث انبیاء ہوتے ہیں۔ عبودیت کا ابتدائی مرحلہ اپنے اختیارات و قوت سے خالی اور بیزار ہو جانا ہے۔ "جس کے ظاہر و باطن میں یگانگت نہ ہو اس کو صدق کی ہوا تک نہیں لگ سکتی اور جس نے نفس کو شناخت کرلیا اس نے خدا کو پہچان لیا۔"

سہل بن عبداللہ کا مکتب تستر کی باغ و بہار سرزمین پر پہاڑ کے دامن میں ایک خاموش اور کم آباد گوشہ میں واقع تھا۔ مکتب کے مشرقی جانب ایک کھلی جگہ پر پانی کے چشمہ کے کنارے ایک خانقاہ تھی۔ یہ خانقاہ مراقبے میں گم اور مشغول عبادت گوشہ نشینوں کے ذکر سے معمور رہتی تھی۔ دروس میں شامل طالب علموں کو کڑی ریاضت' فاقہ کشی اور شب بیداری کے مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔ جان کو تحلیل کرنا پہلی منزل تھی۔ حسین بن منصور کا اس خانقاہ میں اپنا گوشہ' اپنی دنیا اور اپنا جہان تھا۔ وہ ساتھیوں سے الگ چھپ کر بیٹھے رہتے۔ وہ درس میں کم عمر تھے وہ ہمیشہ بے خبر' فہم سے ناآشنا اور اپنی ہی ذات میں گرفتار رہتے تھے۔ وہ عالم استغراق میں ایسی ایسی باتیں کہہ دیتے تھے جو شریعت ظاہرہ کے بالکل منافی ہوتی تھیں اور سہل بن عبداللہ کے دل پر گراں گزرتی تھیں۔ وہ ابن منصور کی ذات میں چھپی ہوئی اس چنگاری پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے جو اسے کسی وقت بھی بھسم

کرسکتی تھی لیکن انہیں حسین ہمیشہ اس چنگاری سے کھیلتا ہوا نظر آتا تھا۔ حسین نہ تو اس خانقاہ میں خوش تھے اور نہ سہل بن عبداللہ کی صحبت سے مطمئن بلکہ ان کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ایک بار حسین کے باپ منصور سے شکایتی انداز میں کہا کہ حسین کی رفتار بہت تیز ہے وہ ضرورت سے زیادہ مضطرب ہے اس کے اشواق شدید اور اس کے مقاصد جلیل ہیں۔ اسے چاہیے کہ شرع کی حدود میں رہ کر ہر بات سوچے۔ مسلمان شرع پر ہے تو مسلمان ہے ورنہ پرشور آدمی کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

سہل بن عبداللہ نے ایک دن حسین بن منصور کو خلوت میں بلا کر سمجھایا کہ راز دار باتوں کا برسرعام کہنا جائز نہیں ہے اس لیے ان باتوں کے اظہار و انکشاف کی اجازت نہیں دی جاسکتی جو تم برسرعام کہتے پھرتے ہو۔ وہ راز جو اللہ تعالیٰ اپنے رازداں بندوں پر منکشف کرتا ہے وہ راز عام لوگوں پر عیاں نہیں ہونا چاہیے۔ یہ جو تم کر رہے ہو یہ جذباتیت اور ایک قسم کی کم ہمتی ہے۔ حسین نے جواب دیا کہ پیرومرشد! مجھ سے جو بھی فعل سرزد ہوتا ہے اس میں میرا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ میرا اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں اور نہ میرے ارادوں کا اس میں کوئی دخل ہے۔ سہل بن عبداللہ نے کہا کہ مجھے یہ تو معلوم نہیں ہے کہ تمہارا تعلق جبریہ مسلک سے ہے یا قدریہ سے لیکن جو کچھ تم کہہ رہے ہو یا کرتے پھر رہے ہو اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ تمہارا تعلق جبریہ مسلک سے ہے۔ یہ الفاظ حسین بن منصور کے دل و دماغ پر بجلی کی طرح پڑے اور وہ تڑپ کر بولے حضرت مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ جو کچھ میرے دل پر گزرتی ہے وہ میں راز میں رکھوں۔ میرا یہ فعل پروردگار عالم کی خواہش کے عین مطابق ہے جو مجھے ان رازوں کے انکشافات میں شریک کرتی ہے۔ وہ خود نہیں چاہتا کہ اس کا راز راز رہے۔ اگر وہ چاہتا کہ اس کے راز دنیا میں عام نہ ہوں تو وہ مجھے جہاں ان رازوں سے واقف کرتا ہے وہاں وہ مجھے اس کا بھی حوصلہ دیتا کہ میں ان رازوں کو سینے میں دبائے رکھنے کا پابند رہتا۔ وہ تو عالم الغیب ہے اسے ہر چیز کا علم ہے کہ کیا ہوتا ہے اور کس کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ سہل بن عبداللہ نے کہا کہ اے حسین بن منصور

مجھ میں اتنی سکت نہیں جو تمہاری اس گستاخانہ گفتگو کو سہہ سکوں۔ خدا تم پر رحم کرے ہر شے کا وقت معین ہے۔ ازل سے جو مقدورات قائم ہو چکے ہیں ان پر خوش رہو۔

اس گفتگو نے حسین بن منصور کو دل برداشتہ کر دیا۔ وہ یہاں نہ تو خود کو پہچاننے میں کامیاب ہو سکے اور نہ ہی خود کو بے چینی و بے قراری کے گرداب سے نکال سکے لہٰذا انہوں نے اس خانقاہ کو چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ اور ابوسہل بن عبداللہ کی خانقاہ سے رخصت ہو کر ایک نسطوری عیسائیوں کے قافلہ کے ساتھ بصرہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

بصرہ ان دنوں اپنے زاویوں، دلدلوں، خانقاہوں اور شفیق استادوں کے باعث اقصائے عالم میں ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ اقامت گاہوں میں طالب علم، مسجدوں کے حجروں میں درویش اور مسافر اور قافلوں کے لیے سرائیں اور بازاروں کی چہل پہل کے باعث بصرہ کی حیثیت ایک علمی چھاؤنی کی سی تھی۔ علمی فضا بڑی وقیع تھی اور اصحاب علم و فضل کے طائفے یہاں موجود رہتے تھے۔ بصرہ دراصل بانسوں کے گھنے جنگل، پرشکوہ مدارس، پرجلال مساجد اور سرسبز کنجوں کا شہر تھا۔ وہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ بصرہ میں قیام کے دوران حلاج کا ربط ضبط بن مجاشع کے ساتھ ہوا یہ لوگ سیاسی اعتبار سے زیدیہ زنج شورش سے تعلق رکھتے تھے اور حکومت وقت کی نظروں میں معتوب تھے۔ حلاج پر بھی اسی اعتبار سے بدگمانی کا اظہار ہوا اور ان ہی اسباب سے انہیں بصرہ چھوڑنا پڑا۔ ابن ندیم لکھتے ہیں کہ ان دنوں ابن منصور اہل بیت کے حق میں راہ ہموار کرتے رہے۔

حسین بن منصور بصرہ چھوڑ کر بغداد میں عمرو بن عثمان المکی کے سلسلہ طریقت سے وابستہ ہوئے اور خرقہ تصوف حاصل کیا۔ عمرو بن عثمان برگزیدہ شخصیت اور اپنے عہد کے بزرگان دین کو شرف مریدی بخش کر ایک عالم میں شہرت اختیار کر چکے تھے۔ شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ آپ شریعت و طریقت میں یکساں طور سے گامزن تھے اور آپ کا شمار اہل ورع اور اہل تقویٰ بزرگوں میں سے ہوتا تھا۔ عرصہ دراز مکہ معظمہ میں اعتکاف کی حالت میں رہ کر پیر حرم کا خطاب حاصل کیا۔ آپ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے پیرومرشد اور حضرت ابوسعید خزار رحمۃ اللہ علیہ کے فیض سے مستفید ہوتے رہے۔ ان کا قول ہے

کہ روح کو شق کر دینے سے قبل قرب الٰہی حاصل نہیں ہو سکتا لیکن اس راستہ میں دو ہزار آگ کے پہاڑ اور ایک ہزار ہلاکت خیز بحر بیکراں ہیں۔ آپ فرماتے تھے کہ عظمت و وحدانیت میں دخل اندازی معصیت و کفر ہے اور جب بندے کی نظر علم عظمت و وحدانیت اور جلال ربوبیت پر پڑتی ہے تو اس کے سینہ میں ایسی فراخی رونما ہوتی ہے کہ اس کو ہر شے نیست محسوس ہونے لگتی ہے۔

عمرو بن عثمان المکی نے حسین بن منصور سے پوچھا کہ سہل بن عبداللہ کی خانقاہ میں کیا کمی تھی کہ تم ہمارے پاس چلے آئے ہو۔ حسین نے جواب دیا کہ "وہ بہت مصلحت اندیش ہیں۔" عمرو بن عثمان المکی نے انہیں نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ "تم عدم و وجود کے کھیل میں جانبدار رہو۔ اپنی توجہ صرف کرو گے تو یہ گتھیاں خود بخود سلجھ جائیں گی۔ تم اپنے اشواق کی شدت کو کبھی محسوس اور کبھی معدوم سمجھتے ہو۔ جس کی اصلاح کے لیے تہذیب نفس ضروری ہے تم ان مجالس میں وقتاً" فوقتاً" آ کر بیٹھ سکتے ہو مگر جب تک راہ شوق اور سیر الی اللہ کے لیے اپنے آپ کو تیار نہ کرو گے یہاں آنا تمہیں کوئی نفع نہیں دے گا۔ تمہاری بے قراری اور جو آگ تمہارے اندر بھڑک رہی ہے ایک دن تمہیں بھسم کر ڈالے گی تم خود ہی اپنی جلائی ہوئی آگ میں جل مرو گے۔"

عمرو بن عثمان نے حسین بن منصور کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ اگر حاکم وقت تمہیں کوئی قیمتی راز بتاتے ہوئے ہدایت کرے کہ اسے افشا نہیں کرنا ورنہ کڑی سے کڑی سزا جو موت بھی ہو سکتی ہے دی جائے گی تو پھر بھی تم اس راز کو اپنے سینے میں نہیں رکھو گے؟ حسین بن منصور نے جواب دیا کہ اگر وہ راز جو حاکم وقت مجھ پر عیاں کرتا ہے واقعی اس قدر پوشیدہ ہے تو پہلی غلطی حاکم وقت کی ہے جس نے مجھے راز داں بنایا۔ جس راز کو وہ خود اپنے سینہ میں نہیں رکھ سکا وہ مجھ سے کیسے توقع رکھ سکتا ہے کہ وہ راز میں اپنے سینے میں چھپائے رکھوں۔ جہاں تک سزا کا سوال ہے تو میرا سر ہر وقت زیر شمشیر رہتا ہے۔ اس صورت میں میرا جرم وہی ہوگا جس کا ارتکاب خود حاکم وقت سے ہو چکا ہے۔ عمرو بن عثمان نے کہا کہ اگرچہ تیری باتوں میں لہو کا رنگ جھلکتا ہے پھر بھی اس امید پر کہ شاید تم اپنی

نادانی سے باز آ جاؤ اور تمہاری جان بچ جائے میں تمہیں اپنی صحبت میں رہنے کی اجازت دیتا ہوں۔

مشہور تھا کہ عمرو بن عثمان کے پاس تصوف کی ایسی نادر کتابیں موجود ہیں جن میں تصوف کے راز ہائے سربستہ پنہاں ہیں۔ حسین بن منصور نے یہ گراں قدر مسودہ جات مطالعہ کے لیے مرشد سے مانگے لیکن انہوں نے کہا کہ تم ابھی مبتدی ہو اور مبتدی منزل سے دور ہوتا ہے۔ تم ابھی ضبط پیدا کرو۔ حسین بن منصور یہ سن کر آبدیدہ ہو گئے اور سجدہ میں پڑ کر گریہ و زاری کرنے لگے۔

"اے رب العالمین--- آخر تیرے بندے مجھ سے بدگمان کیوں ہیں کیا میں تمہاری نافرمانی کی جرات کر سکتا ہوں۔ اے پروردگار تو اچھی طرح جانتا ہے کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ میں جو کچھ کرتا ہوں اس میں میرے ارادوں کو کوئی دخل' نہیں ہوتا' تو تو دلوں کا حال جانتا ہے' میں وہی تو کرتا ہوں جو تو چاہتا ہے۔ تو ہی تو مجھے اس بات پر مجبور کرنے والا ہے کہ میں تمہارے راز جو میرے دل میں ہیں افشا کر دوں۔

اے میرے خالق اگر تو بھی ان بندوں کی طرح سوچتا ہے تو پھر مجھے بتا کہ تو نے مجھ جیسے کمزور و ناتواں انسان کو کیوں اس بار سے لادا ہے۔ تو تو عالم الغیب ہے تو تو بندے کی ہر کیفیت سے آگاہ ہے کیا تو میری استطاعت سے لاعلم تھا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ میں اس بوجھ کو سہہ بھی سکوں گا یا نہیں اور پھر اگر تو نہیں جانتا تو مجھ جیسا کمزور انسان تیرے حکم سے سرتابی کرتے ہوئے اتنا بڑا قدم کیوں کر اٹھائے ہوئے ہے۔"

عمرو بن عثمان یہ سب سن کر غصے میں آ گئے اور حسین بن منصور کو سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ تو گمراہ ہو چکا ہے۔ جو کچھ تم زبان سے کہہ رہے ہو اس کے نتائج بڑے

خطرناک ہوں گے تم ایک عالم کو گمراہ کر ڈالو گے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس سے پہلے کہ تم خدا کی زمین پر شر پھیلاؤ وہ خود ہی تمہیں کوئی عبرت ناک سزا دے چکا ہوگا۔

شیخ فرید الدین عطار ؒ لکھتے ہیں کہ گنج نامہ کا ترجمہ عمرو بن عثمان کے جائے نماز کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ جو غائب ہوگیا۔ آپ نے دوران وضو فرمایا کہ "لے گیا لیکن جو بھی لے گیا اس کے دست و پا قطع کر کے پھانسی پر لٹکا دیا جائے اور اس کو نذر آتش کر کے راکھ تک اڑا دی جائے۔ اس گنج نامہ سے اس کو اس لیے کوئی فائدہ نہ پہنچ سکے گا کہ وہ اس کے بھید تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔"

اس گنج نامہ میں تحریر تھا کہ "جب ہم نے مٹی سے آدم کو تخلیق کیا اور پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ تم اس کو سجدہ کرو تو سبھی نے ہمارے حکم کے آگے سر جھکایا اور آدم کو سجدہ کیا لیکن ابلیس مردود وہ ذات خبیث تھی جس نے انکار کیا کیونکہ وہ واقف اسرار تھا جبکہ فرشتے آدم کی تخلیق کے بھید سے ناآشنا تھے۔ پھر ہم نے کہا دیکھو زمین کی تہہ میں ایک ایسا خزانہ ہم نے دفن کر رکھا ہے کہ جو بھی اس کو تلاش کرنا چاہے یا اس کے حصول کی جسارت کرے گا وہ یقیناً تباہ و برباد ہو جائے گا لیکن ابلیس نے کہا کہ علم و آگہی کا جو خزانہ مجھے حاصل ہے اس کے بعد کسی خزانے کی خواہش نہیں لیکن میں پھر بھی ہر حال میں اس خزانے کی جستجو کروں گا۔ سو ابلیس کو اس کی اجازت اور مہلت دے دی گئی۔"

یہی گنج نامہ کتاب محبت میں اس طرح درج ہے۔

"خدا نے قلب کو روح سے سات ہزار سال قبل تخلیق کر کے انس کے باغ میں رکھا اور سر کو روح سے ایک ہزار سال قبل تخلیق کر کے مقام وصل میں رکھ کر ہر یوم تین سو ساٹھ نظریں ان پر ڈالیں اور کلمات محبت سے ارواح کو واقف کروایا پھر تین سو ساٹھ لطائف اس قلب پر وارد کئے اور تین سو ساٹھ مرتبہ کشف جمال کی تجلیات سر پر ڈالیں اور جب ان سب نے مل کر دوسری مخلوق کو دیکھا تو اپنے سے زیادہ کسی کو برتر نہیں پایا پھر امتحان کے طور پر خدا

تعالیٰ نے سر کو روح میں اور روح کو قلب میں اور قلب کو اجسام میں قید کر کے انبیاء کرام کو ہدایت کے لیے بھیجا اور جب ان سب نے اپنے اپنے مقام کی تلاش کی تو اللہ تعالیٰ نے نماز کا حکم دیا۔ چنانچہ جسم نے نماز کی، قلب نے محبت کی، روح نے قربت کی اور سر نے وصال کی مطابقت کی۔"

حسین بن منصور نے اس مسودہ کو پڑھ کر کہا کہ اس میں وہی کچھ لکھا ہے جو میں کہتا ہوں لیکن لوگ مجھے کافر کہتے ہیں۔ میں منافق نہیں ہوں میں ہر حال میں حق بات صاف گوئی اور جرات کے ساتھ سب کے سامنے کہوں گا۔

ابو یعقوب اقطع بصری کی طبیعت عرصہ دراز سے خراب تھی وہ ان دنوں قریب المرگ تھے اور اپنی جواں بیٹی ام الحسنی کی شادی کے لیے فکر مند تھے۔ حسین بن منصور نے ام الحسنی سے شادی کر لی جن کے بطن سے ایک لڑکی اور تین لڑکے پیدا ہوئے۔ لڑکوں کا نام سلیمان، منصور اور احمد تھے۔ تاریخ میں حسین بن منصور کے بارے میں زیادہ تر روایات ان کے فرزند احمد کے حوالہ سے درج ہیں۔ حلاج کی اس شادی سے عمرو بن عثمان المکی خوش نہیں تھے کیونکہ ان کی ابو ایوب اقطع سے دیرینہ رنجش چلی آ رہی تھی۔ علاوہ ازیں ابن حلاج کے معتقدوں اور مریدوں کی ایک علیحدہ جماعت پیدا ہو چکی تھی جسے عمرو بن عثمان کے حلقہ میں پسندیدگی سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ لہٰذا حسین بن منصور نے عمرو بن عثمان المکی کے دروس سے مراجعت کی اور اپنے سسر ابو یعقوب اقطع کے مشورہ سے حضرت جنید بغدادی ؒ کے حلقہ ارادات میں شامل ہونے کے لیے حاضر ہوئے اس وقت وہ حالت سرمستی اور بے خودی میں تھے۔

بغداد نویں اور ابتدائی دسویں صدی عیسوی میں تصوف کا مرکز تھا۔ بغداد میں تصوف حضرت حسن بصری ؒ جیسے زاہد منش اور رابعہ بصری ؒ جیسی سرمست عاشق حق سے شروع ہو کر پہلے محاسبی پھر ساری الشقائی اور پھر ان کے بھتیجے حضرت جنید ؒ تک پہنچا۔ ابوالقاسم جنید بغدادی قواریری زجاج خراج (م 27 رجب 297ھ) (910ء) تیسری

صدی ہجری کے مشہور نہاوندی بزرگ تھے۔ بغداد میں ولادت ہوئی اور اسی جگہ پر ابد
استراحت گاہ بنی۔ وہ مشہور صوفی سری سقطی کے بھانجے اور مرید تھے تاریخ تصوف میں ا
کو اعلیٰ مقام حاصل ہے اسی لیے سید الطائفہ لسان القوم' طاؤس العلماء اور سلطا
المحققین کے القابات سے ملقب کئے جاتے ہیں۔ آپ حضرت محاسبی کی صحبت سے فیض
یاب ہوئے۔ آپ بحر شریعت و طریقت کے شناور اور انوار الٰہی کا مخزن و منبع اور مکمل علو
پر دسترس رکھتے تھے۔ آپ کا قول ہے کہ "صوفی وہ ہے جو خدا اور رسول کی اس طر
اطاعت کرے کہ ایک ہاتھ میں قرآن ہو تو دوسرے میں حدیث۔" فرماتے ہیں کہ "می
عرصہ دراز تک معصیت کاروں کی حالت پر نوحہ خواں رہا لیکن اب مجھے نہ اپنی خبر ہے
ارض و سما کی۔ دس سال تک قلب نے میرا تحفظ کیا اور دس سال تک میں نے اس ک
حفاظت کی لیکن اب یہ کیفیت ہے کہ نہ مجھے دل کا حال معلوم ہے نہ دل کو میرا۔ مخلو
اس بات سے بے خبر ہے کہ بیس سال سے اللہ تعالیٰ میری زبان سے کلام کرتا ہے اور می
وجود درمیان سے ختم ہوچکا ہے۔ بیس سال سے ظاہری تصوف بیان کرتا ہوں کیوں کہ ا
کے نکات بیان کرنے کی مجھے اجازت نہیں۔ اگر محشر میں خدا تعالیٰ مجھے دیدار کا حکم دے
تو میں عرض کروں گا کہ آنکھ غیر ہے اور میں غیر کے ذریعے دوست کا مشاہدہ نہیں کر
چاہتا۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرا قلب کہیں کھو گیا اور جب میں نے مل جانے کی دعا
تو حکم ہوا کہ ہم نے تمہارا قلب اس لیے لیا ہے کہ تم ہماری معیت میں رہو اور تم قلب
کی واپسی دوسرے کی جانب راغب ہونے کے لیے چاہتے ہو۔ فرمایا کہ "خدا کے بھید خد
کے دوستوں کے قلب میں محفوظ رہتے ہیں اور بہت افضل ہے وہ بندہ جس کو ایک لمحہ ک
لیے بھی قرب الٰہی حاصل ہوا ہو۔"

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اس وقت مدرسہ نظامیہ کے استاد اعلیٰ' عالم بے بدل
اور بغداد کی روح رواں تھے انہیں علم و عمل کا سرچشمہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ مدرسہ نظامیہ
میلوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اس میں فلسفہ یونانی اور تعلیمات اسلامی دونوں شعبے تھے جن م
مایہ ناز فقیہہ درس دیتے تھے اس آئینہ میں خام طبیعتوں کے مس کو کندن بنایا جاتا تھا۔ خد

اور انسان کے بارے میں بحث و استفسار کے دروازے کھلتے تھے۔ ذاتی تجربے کے ساتھ
اسلامی روایات کو ایک نئی زندگی اور نیا آہنگ عطا ہوتا تھا۔ ابن منصور جب سرمستی و بے
خودی کی حالت میں ان کے پاس پہنچے تو عرض کیا کہ میری دل برداشتگی کا سبب یہ ہے کہ میں
اپنی ہوشیاری و مستی کی وجہ سے ہمہ وقت صفات الٰہی میں فنا نہیں رہ سکتا۔ آپ نے فرمایا
کہ تم نے ہوشیاری و مستی کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ میرا کام بھٹکے ہوئے لوگوں کی
راہنمائی کرنا ہے تم راہ حق کے مسافر ہو تو عقیدت مندی کے لیے دل فراخ رکھو۔ ذات
الٰہی تک پہنچنے کا کام اتنا آسان نہیں ہے۔ تم جو یہ کہتے ہو کہ میں ریاکار نہیں ہوں' منافق
نہیں ہوں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ میں افلاطون ہوں' داؤد ہوں' عیسیٰ ہوں'
مہدی ہوں' پیغمبر ہوں' کعبہ ہوں یا کوہ طور ہوں۔ حسین بن منصور نے سوال کیا کہ جب
ساری خدائی بنائی گئی اور انسان کو اشرف المخلوقات بنایا گیا' ابلیس سے سجدہ کروایا گیا تو پھر یہ
سب باتیں انسان سے دور کیوں۔ آپ نے فرمایا کہ تمہیں ابھی تربیت نفس کی ضرورت
ہے' مجاہدہ کرو' ریاضت کرو' غور کرو اور تم ابلیس کی حقیقت کو سمجھو یہ بڑی بڑی باتیں
تمہیں بھٹکا دیں گی۔ یہ نمود و نمائش ہے جس میں تم گرفتار ہو۔ اس سے تم لوگوں سے کیا
منوانا چاہتے ہو؟ جن منزلوں کا تم ذکر کرتے ہو اور جن پر فائز ہونے کا تمہیں دعویٰ ہے
ابھی تم ان راستوں پر چلنے والوں کی گرد راہ بھی نہیں ہو۔ بہروپئے بن کر خلق خدا کو گمراہ
مت کرو۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ جو تم کہہ
رہے ہو کہ کسی مقام پر بھی ازلی اور حادث کا اتصال ممکن نہیں درست نہیں ہے۔ خدا
ادراک سے ماورا ہے۔ کوئی شے اسے احاطہ نہیں کرسکتی۔ کوئی صفت اس کے لیے کافی
نہیں۔ جب تم اس کی تعریف کرنے پر قادر نہیں ہو تو کس اتصال کی بات کرتے ہو۔
تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے' ہر آن' ہر ساعت تمہارے ساتھ
موجود ہے اور یہ جو تمہاری خواہش ہے کہ وہ اور تم ایک ہو جاؤ۔ کامل ادراک سے بھی
آگے جہاں بندے اور خدا میں کوئی فرق اور فاصلہ نہ رہے تمہیں دار تک لے جائے گی۔
بخدا تمہیں شعبدوں نے جو تمہیں اتفاقاً" مل گئے ہیں دیوانہ کر دیا ہے۔ کائنات کے نظام کو

درہم برہم کرکے اپنا وجود قائم کرنا اور اپنی ذات کو منوانا کوئی بڑی بات نہیں۔ تمہارے اندر
بے پناہ ممکنات ہیں۔ مگر تم آسان راستوں سے سفر کرنا چاہتے ہو کیا تم قرامطی ہو! افسوس
ہم تجھے اپنی صحبت میں نہیں رکھ سکتے۔ آج سے پہلے تم نے سہل بن عبداللہ کو چھوڑا اور
عمرو بن عثمان کے پاس رہنے لگے۔ پھر انہیں چھوڑ کر میرے پاس آ گئے ہو۔ تم حسن صحبت
کے تقاضے کا علم نہیں رکھتے' حسن صحبت کا پہلا تقاضا تو یہ ہے کہ انسان ہوش و حواس میں
رہے۔ جبکہ تم ہوش و حواس سے بیگانہ ہو۔ حسین نے جواب دیا کہ جب تک انسان اپنی
انسانی صفات سے بالکل ہی عاری نہ ہو جائے وہ اپنے خالق سے پوشیدہ ہی رہتا ہے اور میں
نہاں و مستور رہنا نہیں چاہتا۔ جنید بغدادی نے غصے میں فرمایا کہ تم ہوش و مدہوش کے
معاملے میں غلط نظریہ رکھتے ہو۔ گوشہ نشینی تمہارے اسباق کے لیے ضروری ہے۔ لہٰذا یہ
تمہارے لئے بہتر ہے کہ تم بیضا یا تستر واپس چلے جاؤ۔ سہیل بن عبداللہ تم پر توجہ کر سکتے
ہیں۔ حسین بن منصور نے کہا کہ آپ کے خیال میں مجھ سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں
آخر ان کا ذمہ دار کون ہے۔ آپ نے فرمایا تم خود ہو۔ حسین نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے
کہا کہ میں جو کچھ کرتا ہوں یا جو کچھ کروں گا سب من جانب اللہ ہے اور یہ ایک ایسا راز
ہے جسے میں کسی طور پر بھی پوشیدہ نہیں رکھ سکتا' رکھنا بھی چاہوں تو مجھ سے ایسا نہیں
ہوگا۔ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اے ابن منصور تو جو کچھ کہتا پھر رہا ہے اس سے یقیناً تو
کسی نہ کسی دھاتی چیز کو اپنے لہو سے رنگ کرکے ہی باز آئے۔ اس پر ابن منصور نے کہا کہ
مجھے بھی علم ہے کہ میرے ساتھ کیا برتاؤ کیا جانے والا ہے۔ میں اس سولی کو بھی دیکھ رہا
ہوں جس پر میرا جسم سجے گا لیکن اے شیخ چاہے کچھ بھی ہو میں جو کچھ دل میں ہے زبان پر
لاتا رہوں گا چاہے اس سے کسی کے رازوں کے افشاء ہونے کا ڈر ہو یا نہ ہو۔ روایت ہے
کہ اس موقعہ پر انہوں نے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو کہا کہ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ
آپ ظاہر کا پیراہن پہن کر خلیفہ وقت کے حکم سے میرے خلاف فتویٰ دستخط کر رہے ہیں
لیکن یہ روایت اس لیے درست نہیں ہے کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ اس فتویٰ سے بہت پہلے
297ھ میں وفات پا گئے تھے۔ ابو یعقوب اقطع نے انہیں سمجھایا کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی

طرف مائل کرو وہی تمہارے مرشد کامل ہو سکتے ہیں لیکن انہوں نے تلخی سے جواب دیا کہ
میں خود مرشد ہوں مجھے کسی مرشد کی ضرورت نہیں ہے میں اپنے اندر اور باہر سفر کرنے
کی سمتیں جانتا ہوں منزلیں خود میری طرف سفر کریں گی۔ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ
حضرت جنید نے انہیں قبول نہ کیا اور اس سبب سے سب نے انہیں مہجور کر دیا پس وہ
مہجور معاملات ہیں مہجور اصل نہیں۔

883ء میں حسین بن منصور نے پہلی بار فریضہ حج ادا کیا۔ روایت ہے کہ وہ حرم
کعبہ میں داخل ہونے کی بجائے کبھی غار حرا کے سامنے کبھی غار ثور کی بلندیوں پر' کبھی جبل
رحمت اور کبھی منی اور عرفات میں دوپہر کی تپتی دھوپ میں تپتے پتھروں پر بیٹھے رہتے تھا۔
پھر مدینہ منورہ میں زیارت آستانہ صاحب لولاک پر حاضر ہوئے اور رمضان المبارک کے
روزے رکھنے کے بعد واپس مکہ معظمہ پہنچے اور فریضہ حج تک وہیں مقیم رہے۔ مکہ معظمہ
میں لوگ ان کی دعاؤں کے طالب رہتے اس کے چہرے پر التہاب ذات کا پرتو ہوتا اور جسم
پر تشنج کی کیفیت۔

897ء میں وہ اپنے بیوی بچوں کو بیضا میں چھوڑ کر تستر چلے گئے انہوں نے تستر میں
صوفیانہ لباس ترک کر دیا اور ایک عام آدمی کی وضع اختیار کرکے رشد و ہدایت کا سلسلہ
شروع کیا۔ جس کا بنیادی مقصد اپنے ہی دل کے اندر خدا کی تلاش تھا۔ روایت ہے کہ بیضا
کے باغات میں انگور دس مثقال کا اور سیب کی گولائی دو بالشت تک پہنچتی ہے اور یہ سب
حسین بن منصور کی کرامات شمار ہوتی ہیں۔ مشہور ہے کہ وہ شیر پر سوار ہوتے تھے اور
سانپ کو کوڑا بناتے تھے' اور سردیوں کے پھل گرمیوں میں اور گرمیوں کے پھل سردیوں
میں لے آتے تھے۔ ہوا میں ہاتھ بلند کرکے واپس لاتے تو وہ ایسے درہموں سے بھرا ہوتا
جن پر قل ھو اللہ احد لکھا ہوتا تھا۔ وہ لوگوں کو ان کے اعمال اور ان کے دلوں کی باتوں سے
آگاہ کرتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن نہا کر باہر نکلے تو ایک منکر ان کے پیچھے ہولیا اور
آپ کی گدی پر زور سے ایک چپت دے ماری' آپ نے اس سے پوچھا۔ تو نے مجھے کیوں
مارا ہے۔ اس نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے۔ آپ نے اسے کہا۔ اب دوبارہ ایسا کر'

مارنے کے لیے اوپر ہاتھ اٹھایا تو وہ سوکھ گیا آپ کے قول "انا الحق" کے چرچے ہونے شروع ہوئے، تو لوگوں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں "انا الحق" کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔ پھر ان سے یہ اشعار سنے گا۔

مجھے تجھ پر اور اپنے اوپر تعجب ہے کہ تو نے اپنے ساتھ مشغول کر کے مجھے خود میں سے فنا کر دیا۔

مجھے خود سے اتنا قریب کیا کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ تو میں ہے۔

مجھ کو شراب (محبت) پلا کر کہتے ہیں کہ گا نہیں حالانکہ اگر سرات سے پہاڑوں کو وہ شراب محبت پلا دی جاتی جو مجھے پلائی گئی ہے تو وہ بھی گانے لگتے۔

آرزو یہ ہے کہ میں اس کی محبت میں مرجاؤں، اس کی یہ آرزو ہمارے نزدیک ہر چیز سے زیادہ آسان ہے۔

لوگوں نے جب ان سے اس قسم کی باتیں سنیں تو ان کے بارے میں سوءظن کرنے لگے۔ ابوالقاسم بن کج نے بیان کیا ہے کہ صوفیاء کا ایک گروہ حسین بن منصور کے پاس گیا۔ وہ اس وقت تستر میں قیام پذیر تھے۔ انہوں نے ان سے کرامت کا مطالبہ کیا وہ انہیں آتش کدہ کی طرف لے گئے۔ محافظ نے ان کو روکا اور کہا کہ دروازہ بند ہے اور چابی موبد کے پاس ہے۔ حسین نے قفل کو جھاڑا تو قفل کھل گیا اور وہ تمام لوگ آتش کدہ میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک قندیل دن رات جل رہی ہے اور بجھتی نہیں۔ محافظ نے کہا کہ یہ اس آگ کا حصہ ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ڈالے گئے تھے۔ ہم اس سے برکت حاصل کرتے ہیں اور مجوسی اسی آگ کو لے کر مختلف ممالک کی طرف جاتے ہیں اس سے دریافت کیا گیا کہ کیا کوئی اس آگ کو بجھانے کی قدرت رکھتا ہے تو اس نے جواب دیا ہم نے اپنی کتاب میں پڑھا ہے کہ سوائے عیسیٰ بن مریم کے کوئی اسے بجھا نہیں سکتا۔ حسین نے اپنی آستین سے اشارہ کیا تو وہ قندیل بجھ گئی۔ محافظ نے کہا قیامت آگئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس گھڑی مشرق اور مغرب میں مجوسی کی آگ

بجھائی جائے گی۔ اس سے پوچھا گیا کہ اس کو دوبارہ کون روشن کرسکتا ہے۔ اس نے کہا۔ ہم نے اپنی کتاب میں پڑھا ہے کہ اس کو وہی شخص دوبارہ روشن کرسکتا ہے جو اس کو بجھانے کی قدرت رکھتا ہے۔ پھر وہ اشکبار ہو کر حسین سے التجا کرتا رہا۔ حسین نے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو آنے والے مشائخ کو پیش کی جاسکے۔ گھر کے اندر ایک صندوق تھا جس میں دینار پڑے ہوئے تھے اس نے اسے کھولا اور دینار مشائخ کے حوالے کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔ حسین نے یہ مال واپس لوٹاتے ہوئے آستین سے اشارہ کیا اور وہ قندیل جل اٹھی۔ اس موقعہ پر لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے حسین بن منصور نے کہا کہ

1- دنیا نے مجھے دھوکا دیا اور وہ اپنے فریب کن مناظر اور محاسن سے مجھے دھوکا دینا چاہتی تھی۔

2- مجھے دنیا کی اتنی پہچان ہے کہ بادشاہ (اللہ) نے اس کی حرام کردہ چیزوں سے منع کیا اور میں حلال سے بچتا ہوں۔

3- اس (دنیا) نے میری طرف اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا بس میں نے اس کا دایاں اور بایاں دونوں ہاتھ لوٹا دیئے اور میں دنیا کے فریب کن محاسن کا اسیر نہ بنا۔

4- میں نے نکاح کا پیغام کب دیا تھا جو وصال کا ارادہ کرتا۔

5- پس میں نے اس کو محتاج پایا۔ اس لیے میں نے اس کی لذت اسی کو ہبہ کر دی جو چیز محتاج ہے اس سے کیا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

مختلف علاقوں میں آپ کے ہمنوا اور معتقد پیدا ہوئے لیکن اس سے زیادہ شدت الفت میں پیدا ہوئی لہٰذا وہ مشرقی ایران میں سکونت پذیر ہوئے اور وہاں پانچ برس تک تعلیمات پھیلاتے رہے۔ 904ء میں انہوں نے اپنے مریدوں کے ساتھ دوسرا فریضہ حج ادا کیا اور حج کے بعد ممالک اسلامیہ اور ہندوستان کی سیر و سیاحت کی وہ ملتان کے راستے کشمیر گئے اور وہاں سے دیوار چین تک پہنچے۔ 906ء میں انہوں نے دوسرے مذاہب کا بھی مطالعہ کیا اور بدھ مت، ہندو مت اور مانویت کے متعلق بہت سی معلومات حاصل کیں۔

حسین بن منصور کی شخصیت کے بارے میں مورخین اور محققین نے اپنے اپنے
نقطہ نظر سے اظہار خیال ہے کہ' آیئے ان آراء کو تاریخی شواہد کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

شخصیت

حسین بن منصور کی زندگی میں ہی ان کی شخصیت مبعوث فیہ بن گئی تھی جس کی بڑی وجہ عمرو بن عثمان کا ناراض ہونا اور سیاسی اعتبار سے ضبط بن مجاشع سے تعلقات تھے۔ ان کے قتل کے بعد اغلب مشائخ کبار نے ان کے مرتبے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ تصوف میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے جبکہ متاخرین نے انہیں قبول کیا ہے اور بعض صوفیہ اس معاملے میں متوقف ہیں۔ بعض نے ان کا شمار ساحروں میں کیا ہے اور بعض نے ان کی تکفیر کی ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ وہ اصحاب حلول میں سے تھے۔ اور بعض نے ان پر اتحاد کا الزام لگایا ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں ان کی پراسرار شخصیت کے بارہ میں علماء' عرفا' صوفیہ' مورخین اور محققین کے تین گروہ بنے جو اب تک موجود ہیں۔ ایک گروہ انہیں عارف' خدا رسیدہ اور مرد مومن جبکہ دوسرا گروہ انہیں ملحد' زندیق (قرامطی) اور کافر قرار دیتا ہے۔ تیسرا گروہ ان کے بارہ میں توقف کرتا ہے نہ انہیں مومن کہتا ہے اور نہ کافر۔ آیئے ان کی شخصیت کو تاریخ کے آئینہ میں دیکھتے ہیں۔

ابراہیم ابن فاتک جو حسین بن منصور کے ہمعصر ہیں سے روایت ہے وہ ایک دن حسین بن منصور کے گھر داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ سر کے بل کھڑے ہیں اور خدا سے کہہ رہے ہیں کہ

> "اے وہ ذات جو پیوست ہے میرے دل میں. قریب کے لحاظ سے اور دور ہے مجھ سے جیسے دور ہونا قدیم کا حادث سے ہے بلحاظ غیوبت۔ تو منکشف ہوتا ہے مجھ پر یہاں تک کہ میں تجھ "الکل" سمجھنے لگتا ہوں اور تو دور کیا جاتا ہے مجھ سے یہاں تک میں تیری نفی کرنے لگتا ہوں تو اس صورت میں نہ تو تیرا بعد باقی رہتا ہے اور نہ

تیرا قرب نفع دیتا ہے اور نہ تیری حرب مجھے نفع دیتی ہے اور نہ تیری صلح مجھے ایمن کرتی ہے۔"

جب انہوں نے مجھے دیکھا تو کہا کہ بے خوف اندر آجاؤ اس وقت ان کی آنکھیں انگارے کی مانند دہک رہی تھیں۔ مجھ سے کہنے لگے۔

"اے بیٹے! بعض لوگ گواہی دیتے ہیں کہ میں ولی اللہ ہوں اور بعض لوگ گواہی دیتے ہیں کہ میں کافر ہوں۔ جو لوگ مجھے کافر کہتے ہیں وہ لوگ مجھے اور خدا کو ان لوگوں سے عزیز تر ہیں جو مجھے ولی کہتے ہیں۔ جو لوگ مجھے ولی سمجھتے ہیں وہ میرے متعلق حسن ظن رکھتے ہیں لیکن جو مجھے کافر سمجھتے ہیں وہ تعصب دینی کی بقاء پر ایسا سمجھتے ہیں اور جس نے دین میں تعصب کیا وہ اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہے جس نے کسی کے متعلق حسن ظن سے کام لیا۔ اور ابراہیم تیرا کیا حال ہوگا جب تو مجھے مصلوب ہوتے، قتل ہوتے اور آگ میں جلائے جاتے دیکھے گا؟ بے شک وہ دن میری تمام عمر کے ایام میں اسعد ہوگا۔"

احمد بن ابی الفتح بن عاصم الیبضاوی جو حسین بن منصور کے ہم عصر اور میل جول والے تھے سے روایت ہے کہ انہوں نے حلاج کو اپنے شاگردوں کو یہ لکھواتے سنا کہ

"بے شک اللہ کی ذات واحد ہے، قائم بنفسہ ہے، اپنے قدم کی وجہ سے اپنے غیر سے منفرد ہے اور اپنی ربوبیت کی وجہ سے اپنے ماسوا سے متوحد ہے۔ کوئی شے اس سے ممازج نہیں ہو سکتی اور غیر اس سے مخالط نہیں ہو سکتا۔ مکان اس کا احاطہ نہیں کر سکتا اور زمان اس کا ادراک نہیں کر سکتا۔ فکر انسانی اس کا اندازہ نہیں کر سکتی اور تصور انسانی اس کی صورت نہیں بنا سکتا اور نگاہ اسے دیکھ نہیں سکتی اور خطرہ اس کا خیال نہیں کر سکتا۔"

ابو اسحق ابراہیم بن عبدالکریم حلوان، نہ صرف حسین بن منصور کے ہم عصر تھے
لہ ان کے شاگردوں میں سے تھے۔ ان سے روایت ہے کہ انہوں نے دس سال تک
لاج کی خدمت کی اور لوگوں کے مقابلے میں اس سے بہت زیادہ قریب رہا۔ ایک دن یہ
وچتے ہوئے کہ بعض لوگ انہیں زندیق کہتے ہیں کیوں نہ ان کا امتحان لیا جائے۔ میں نے
ن سے کہا یا شیخ! میں چاہتا ہوں کہ میں باطنی مذہب کا کچھ علم حاصل کروں۔ یہ سن کر
نہوں نے پوچھا کہ تم باطل کے باطن سے آگاہ ہونا چاہتے ہو یا حق کے باطن سے؟ پھر کہا۔

"حق کا باطن یہ ہے کہ اس کا ظاہر شریعت ہے اور جو شخص اتباع شریعت کرے گا اس پر حق کا باطن خود بخود منکشف ہو جائے گا اور حق کا باطن المعرفتہ باللہ ہے۔ اب رہا باطن الباطل تو باطل کا باطن اس کے ظاہر سے اقبح ہے اور اس کا ظاہر اس کے باطن سے اشنع ہے۔ پس تو اس میں مشغول نہ ہونا اور میرا حال یہ ہے کہ میں نے کبھی فرض نماز نہیں پڑھی جب تک وضو سے پہلے غسل نہ کیا ہو۔ اب میں ستر سالہ ہوں اور میں نے پچاس سال میں دو سو سال کی نمازیں پڑھ لی ہیں۔"

تاریخ بغداد میں احمد بن حسین بن منصور کا بیان اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ "ان
ے والد حسین بن منصور کسی وقت کھردرا موٹا کپڑا پہنتے کبھی وہ بے سلے رنگین کپڑوں میں
ہتے کبھی دراعہ اور پگڑی پہنتے کبھی سپاہیوں کے لباس کی مانند قبا پہن کر چلتے، تستر سے
رہ تک پہلا سفر اٹھارہ سال کی عمر میں کیا۔ پھر دو فرقوں میں ملبوس ہو کر عمرو بن عثمان المکی
، جنید بن محمد رحمۃ اللہ علیہ کی طرف گئے، عمرو المکی کے ساتھ اٹھارہ مہینے مقیم رہے، پھر میری
لدہ ام المومنین بنت ابی یعقوب الاقطع سے شادی کی۔ اس شادی سے عمرو بن عثمان سے
قات ناگفتہ بہ ہو گئے۔ ان میں اور ابو یعقوب میں اس وجہ سے بڑی وحشت اور نفرت
ہ گئی۔ پھر میرے والد جنید بن محمد رحمۃ اللہ علیہ کے پاس چلے گئے اور اپنی قلبی اذیت کا اظہار کیا۔
ابو یعقوب اور عمرو بن عثمان کے درمیان مخالفت کی وجہ سے ان کو پہنچی تھی۔ جنیدؒ نے

صبر و سکون سے رہنے کی تلقین کی۔ ایک مدت تک اس اذیت ناک حالت پر صبر کیا۔
مکہ کی طرف کوچ کیا۔ ایک سال قیام کرنے کے بعد فقراء کی ایک جماعت کے ساتھ بغ
وارد ہوئے اور جنید بن محمدؒ کے پاس گئے اور ایک مسئلہ کے متعلق پوچھا لیکن انہوں
اس کا جواب نہ دیا۔ وہ بہت متوحش ہوئے میری والدہ کو ساتھ لے کر تستر واپس لو
اور ایک سال تک وہاں قیام کیا۔ انہیں اس قدر قبولیت عامہ نصیب ہوئی کہ اس دور
اکابرین نے اس پر حسد کرنا شروع کر دیا۔ عمرو بن عثمان ان کے بارے میں خورستان وا
کو برابر خطوط لکھتا رہتا تھا۔ جن میں اس کے بارے میں بڑی بڑی باتوں کا دعوے کر
یہاں تک کہ آپ نے صوفیا کا لباس اتار دیا اور قبا زیب تن کر لی اور ابنائے دنیا کی صح
اختیار کر لی' پھر تستر سے روانہ ہو گئے اور پانچ سال تک ہم سے غائب رہے۔ خراسان
علاقہ ماوراء النہر پہنچ گئے۔ پھر وہاں سے بجستان اور کرمان میں وارد ہوئے۔ پھر فارس لو
اور لوگوں میں تبلیغ شروع کی۔ آپ اس دوران تبلیغی مجالس منعقد کرتے اور لوگوں کو
راست کی طرف بلاتے۔ اس زمانہ میں انہوں نے چند کتب بھی تصنیف کیں۔ پھر فا
سے اہواز کی طرف گئے وہاں سے ایک شخص کو بھیجا جس نے مجھے ان کے پاس پہنچا دیا۔
بصرہ گئے اور وہاں تھوڑی مدت تک قیام کیا اور مجھے اپنے اصحاب کے پاس چھوڑ آئے۔
دوبارہ مکہ گئے۔ پیوند شدہ لباس اور کمر میں پٹی پہن لی۔ اس سفر میں ان کے ساتھ جم
نکلا اور ابو یعقوب نہر جوری نے عوام کی عقیدت کو دیکھ کر حسد کرنا شروع کر دیا اور ان
بارے میں نازیبا باتیں کیں۔ پھر بصرہ کی طرف لوٹے اور ایک ماہ تک قیام کیا۔ پھر ا
آئے۔ میری والدہ اور اہواز کے اکابرین کی ایک جماعت کو بغداد لے آئے۔ بغداد
ایک سال قیام کیا۔ اپنے ایک عقیدت مند سے کہا کہ میرے بیٹے کا میری واپسی تک د
رکھنا۔ میں چاہتا ہوں کہ ان ممالک کی طرف جاؤں جہاں شرک پھیلا ہوا ہے اور لوگو
اللہ کی طرف بلاؤں۔ پھر میں نے سنا کہ انہوں نے ہندوستان جانے کا ارادہ کیا۔ پھر د
مرتبہ خراسان کی طرف گئے اور ماوراء النہر سے ہوتے ہوئے ترکستان اور ماچین گئے
مخلوق کو اللہ کی طرف بلایا اور راہ ہدایت کی طرف لانے کے لیے ان کے لیے کتب تص

کیں۔ جو مجھ تک نہیں پہنچیں۔ اس سفر سے واپس آنے کے بعد ان کے بارے میں
مختلف قسم کی باتیں پھیل گئیں۔ انہوں نے کچھ دیر قیام کیا اور پھر تیسری بار حج کرنے کے
لیے نکلے اور دو سال تک مکہ میں مجاور بیت اللہ رہے۔ پھر واپس لوٹے اور ان کی پہلی
حالت تبدیل ہو چکی تھی۔ مجھے سلمان خانہ نے بغداد میں روک رکھا تھا اور ایک گھر تعمیر کیا
اور لوگوں کو ایسے اہم اور دقیق امور کی طرف دعوت دینا شروع کی جس کا میں کما حقہ احاطہ
نہیں کر سکا۔ اس وقت محمد بن داؤد اور علماء کی ایک جماعت نے ان کے خلاف خروج کیا۔
ان کی ظاہری حالت کو برا جانا' بصر قسوری کی وجہ سے ان میں اور علی بن عیسیٰ (وزیر) میں
چل گئی۔ شبلی اور دیگر صوفیاء بھی (بظاہر) ان کے خلاف ہو گئے' بعض انہیں جادوگر اور
بعض مجنون قرار دیتے جب کہ بعض انہیں صاحب کرامت اور قبولیت دعا کا اعجاز رکھنے والا
قرار دیتے تھے۔ لوگوں میں یہ اختلاف جاری تھا کہ بادشاہ نے انہیں گرفتار کر کے قید کر
دیا۔"

ابن عطاء کا شمار بہت بڑے شیوخ میں ہوتا ہے۔ ابو سعید خزازؒ ابن عطاء کے مقابلے
میں کسی دوسرے کو صوفی تصور نہیں کرتے تھے۔ آپ کا قول ہے "اسرار کو میدان عمل
میں تلاش کرو پھر میدان حکمت میں اور پھر میدان توحید میں اور اگر کہیں نہ ملیں تو
امیدوں کو منقطع کر لو۔" ایک اور قول ہے کہ "خدا کے سوا اگر کوئی شخص کسی دوسری
شے سے سکون حاصل کرتا ہے تو آخر کار یہی شے اس کے لیے باعث ہلاکت بن جاتی
ہے۔ بعض بندے ایسے بھی ہیں جن کا اتصال خدا کے ساتھ اس طرح ہے کہ ان کی
آنکھیں اسی کے نور سے روشن ہیں ان کی حیات اسی کے دم سے قائم ہے اور یہ اتصال
انہیں خوف یقین کی صفائی اور دائمی نظر کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔" ماسینیون کی تحقیق
کے مطابق یہ بزرگ حسین بن منصور کو قید خانہ میں صرف اس لیے ملتے رہے کہ حلاج
سے ان کی تحریریں حاصل کر کے محفوظ کر لی جائیں اور بعد میں اپنے خلف علی الملطی کو
سونپ دیں۔ انہوں نے حلاج کی طرفداری میں بڑا زور لگایا اور حنبلیوں کی ایک جماعت
کو حلاج کی حمایت کے لیے ابھارا اور خود بڑی جوانمردی و دلاوری کے ساتھ حکومت وقت

سے کہا۔ "میں حلاج کی طرف خدائے یکتا کے ساتھ صوفیانہ وصال رکھتا ہوں اور یہ امر ہر طرح کی بزرگی و عظمت کا مظہر ہے۔" وزیر کے پاسبانوں نے انہیں مار مار کر ہلاک کر دیا اور وہ حلاج کی موت سے پندرہ یوم پہلے داعیٔ عدم ہوئے۔

ابوبکر بن ابی اسحاق کلا بازی (م 971ء) تصوف کے علاوہ فقہ میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے کتاب التعرف کے علاوہ 222 منتخب احادیث کی شرح لکھی جس کا نام بحر الفوائد فی معانی الاخبار ہے۔ آپ نے جب ہوش سنبھالا تو عالم اسلام میں حلاج کا نام علماء کے فتوئ کفر کی وجہ سے مورد طعن و تشنیع بنا ہوا تھا۔ لہٰذا انہوں نے حلاج کے اقوال ان کے نام لکھے بغیر ایک بڑے صوفی یا ان کی کنیت لکھ کر کتاب التعرف میں تحریر کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ابوالمغیث کبھی رات کو نہیں سوتے تھے اور نہ آرام کرتے تھے کیونکہ وہ قائم اللیل تھے۔ تمام رات نماز اور عبادت میں بسر کرتے تھے' جب نیند ان پر غلبہ• کرتی تھی اور ان کے پپوٹے بھاری ہو جاتے تھے تو وہ اپنی پیشانی اپنے گھٹنوں پر رکھ کر تھوڑی دیر کے لیے اونگھ جاتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ "اپنے نفس کے ساتھ ترس کیجئے۔" انہوں نے جواب دیا۔ "واللہ جب خدائے مہربان نے میرے ساتھ مہربانی نہیں کی تو میں نفس کو راحت کیوں پہنچاؤں۔ کیا تو نے سید المرسلین (ﷺ) کا یہ قول نہیں سنا کہ سب سے زیادہ بلائیں (مصائب) انبیاء پر آئی ہیں پھر ان کے بعد ان پر جو ان کی مثل ہوں' پھر ان کے بعد ان پر آئی ہیں جو ان کی مثل ہوں۔"

دوسری جگہ بھی حلاج کا ذکر ان کی کنیت ہی سے کیا گیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ "میرے شیوخ میں سے ایک شیخ نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا کہ میں نے اپنے دوست محمد ابن سعدان سے سنا کہ میں (ابن سعدان) نے بیس سال تک ابوالمغیث کی خدمت کی اور

ان کی محبت اٹھائی مگر اس طویل عرصے میں نہ تو کبھی انہوں نے کسی شے کے فوت یا ضائع ہو جانے پر اظہار تاسف کیا اور نہ کوئی ایسی شے طلب کی جو ان کے پاس نہ ہو۔"

کلاباذی کی نگاہ میں حلاج کی جس قدر عظمت تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ان کی تصنیف میں باب پنجم اہم ترین ہے اور اس میں انہوں نے صرف حلاج کو اپنی تائید میں پیش کیا۔ حالانکہ وہ شیخ فارس کے مرید تھے اور یہ بزرگ' حلاج کے بہت بڑے حاسدوں میں سے تھے۔ کلاباذی حلاج کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ:

"قبل" اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا (سبقت نہیں کر سکتا) اور "بعد" اسے قطع نہیں کر سکتا۔ "من" تقدم حاصل کرنے یا آگے بڑھنے کے لیے اس کا مقابلہ (مصادرہ) نہیں کر سکتا۔ "عن" اس سے موافقت نہیں کر سکتا۔ "الی" اس سے وابستہ نہیں ہو سکتا۔ "فی" اسے اپنے اندر نہیں لے سکتا۔ "اذ" اسے روک نہیں سکتا۔ "ان" اس سے مشورہ نہیں کر سکتا۔ "فوق" اس پر سایہ انداز نہیں ہو سکتا۔ "تحت" اسے سہارا نہیں دے سکتا۔ "حذا" (ضد) اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ "عند" اس سے مزاحم نہیں ہو سکتا۔ "خلف" اس کو جکڑ نہیں کر سکتا۔ "امام" اسے محدود نہیں کر سکتا۔ "کل" اسے جمع نہیں کر سکتا۔ "کان" اسے موجود نہیں کر سکتا۔ "لیس" اسے گم نہیں کر سکتا۔ "خفاء" اسے پوشیدہ نہیں کر سکتا۔ اس کی قدامت' زمان (حدوث) پر سابق ہے اور اس کا وجود' عدم پر سابق ہے اور اس کی ازلیت' غایت (حد) پر سابق ہے اگر تو نے قبل کہا (اسے قبل سے تعبیر کیا) تو قبل تو اس کے بعد ہے اور اگر تو نے ھو (وہ) کہا تو ھا اور واؤ دونوں اس کی مخلوق ہیں اور اگر تو نے "کیف" کہا تو اس کی ذات اوصاف سے محجوب ہو جائے گی اور اگر تو نے این کہا (وہ کہاں ہے) تو اس کا وجود تو مکان پر مقدم ہے اور اگر تو

ماھو کہا (ماہیت دریافت کی) تو اس کا ھویتہ (ذات) تمام اشیائے کائنات سے مبائن (مختلف) ہے۔ اس کے غیر کو ایک ہی وقت میں دو صفات متضادہ سے متصف نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کی ذات میں صفات متضادہ کوئی تضاد یا تخالف پیدا نہیں کرتیں۔ پس وہ اپنے ظہور میں باطن (پوشیدہ) ہے وہ ظاہر بھی ہے' باطن بھی ہے۔ القریب بھی ہے ابعد بھی ہے اور اس اعتبار سے مخلوقات سے مشابہت سے وراء الوراء ہے۔ وہ بغیر مباشرت فائل ہے اور بغیر ملاقات تفہیم کرتا ہے اور بغیر ایماء ہدایت کرتا ہے۔ خواہشات اس سے منازعت نہیں کرسکتیں اور افکار اس سے مخالفت نہیں کرسکتے۔ اس کی ذات کے لیے تکیف (کیسی ہے) یا کیفیت ثابت نہیں کی جاسکتی اور اس کے افعال کے لیے کوئی تکلیف (سعی) ثابت نہیں کی جاسکتی۔"

ابوبکر شبلی ؒ (877ء تا 947ء) معرفت و حقیقت کے منبع و مخزن جانے جاتے ہیں۔ حضرت جنید بغدادی ؒ ان سے متعلق فرماتے ہیں کہ شبلی کا وجود مخلوق کے درمیان عین الٰہی ہے اور انہوں نے خواب میں حضرت رسول ﷺ کو شبلی کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ ابوبکر شبلی حسین بن منصور کے نہ صرف ہم عصر ہیں بلکہ واقف حال بھی تھے۔ جامع بغداد میں قبتہ الشعراء کے نیچے حلاج پر شیفتہ ہوئے۔ اگرچہ انہوں نے حلاج پر مقدمہ کے دوران ان کے آدھے عقائد سے انکار کر دیا تھا لیکن حلاج کی موت کے وقت ان کے دیدار کے لیے بھاگے اور سنگسار کرنے والے گروہ کے درمیان کھڑے ہو کر ایک شاخ گل حلاج کی طرف پھینکی۔ حسین بن منصور کے بارے میں ان کا قول ہے کہ "میں اور حلاج ایک ہی چیز ہیں میرے جنون نے مجھے مخلصی دلا دی اور اس کی عقل نے اسے ہلاک کر ڈالا۔"

ابونصر سراج (م 991ء) ایک بہت بڑے عالم و عارف تھے۔ انہیں ظاہری اور باطنی

علوم پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ روایت ہے کہ آپ نے حضرت سری سقطی اور سہیل بن عبداللہ تستری کو بھی دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنی تصنیف کتاب اللمع فی تصوف میں حلاج کا ذکر کرتے ہوئے پانچ مقامات پر ان کے نام کے ساتھ "رحمت اللہ علیہ" لکھا ہے۔

ابوعبداللہ بن خفیف (م 984ء) شیرازی الاصل صوفی تھے۔ مسلک شافعی تھا علوم باطنی کے ساتھ ساتھ علوم ظاہری سے بہرہ ور تھے۔ ریاضت و مجاہدے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اپنے وقت کے مشہور صوفی حضرت رویم کے مرید اور حلاج کے آخری لمحات کے شاگردوں میں سے تھے۔ فرقہ خفیفی ان کی جانب منسوب ہے جن کا مذہب تصوف "غیبت و حضور" ہے غیبت سے مراد دل کا اپنے وجود سے غائب رہنا جبکہ حضور سے مراد اس کا خدا کے ساتھ رہنا ہے۔ (جو شخص اپنے سے غائب ہے وہ خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہے) لکھتے ہیں کہ "حسین بن منصور عالم ربانی تھے۔"

عمرو بن عثمان المکی جن کے مدرسہ میں حسین بن منصور بطور طالب علم داخل رہے سے روایت ہے جسے ابوالقاسم قشیری (م 1082ء) نے اپنے رسالہ قشیریہ میں بیان کیا ہے کہ عمرو بن عثمان المکی نے حسین بن منصور کو دیکھا کہ وہ کچھ لکھ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا کیا لکھ رہے ہو۔ حلاج نے جواب دیا میں قرآن کا جواب لکھ رہا ہوں یہ سن کر انہوں نے ملامت کی اور ان کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے۔ اس واقعہ کو عبدالرحمٰن السلمی (م 1025ء) نے اپنی تصنیف طبقات الصوفیہ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ "ایک دن میں حلاج کے ساتھ مکے کی گلیوں میں جا رہا تھا اس نے میری قرات سن کر کہا اس قرآن کا مثل پیش کرنا میرے لیے ممکن ہے۔ یہ سن کر میں اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔"

مورخ ابوبکر الصولی جو حلاج کا ہم عصر تھا اور اس نے کئی دفعہ حلاج سے ملاقاتیں بھی کی تھیں لکھتا ہے کہ حسین بن منصور ایک ایسا جاہل تھا جو عاقل ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ ایسا خبیث تھا جو زاہد ہونے کا مدعی تھا ایسا فاجر تھا جو خود کو عابد ظاہر کرتا تھا اور ایسا راغب دنیا تھا جو زاہد ہونے کا مدعی تھا۔

غریب بن سعد قرطبی (م 983ء) نے اپنی تصنیف تاریخ صلہ طبری میں 904ء سے

933ء کے زمانے کا حال بیان کرتے ہوئے ابن منصور کے آخری دس سالہ وقائع
913ء تا 923ء میں قلمبند کیے ہیں۔ اس دور میں ابن منصور کو زبردست مخالفت کا سا
اور سرکردہ حکومتی اور مذہبی مخالفت کے باعث وہ 910ء میں دشت سوس چلے گئے
913ء میں گرفتار ہوئے اور مسلسل نو سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے ر
قرطبی لکھتے ہیں کہ "حلاج ایک گمراہ اور خبیث آدمی تھا۔ شہر .شہر پھرتا اور جاہلوں کو
دیا کرتا تھا۔ .بعضوں کو اہل بیت کا داعی اور .بعضوں کو سنی بتاتا۔ شیعوں میں شیعہ اور م
میں معتزلی بن جاتا تھا۔ ہاتھ کا چالاک اور شعبدہ باز تھا۔ طب کا دعویٰ تھا۔ کیمیا کا تجر
ہمیشہ شعبدے کرتا اور بہت سے بیوقوفوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا پھر خدائی کا دعویٰ کیا
حلول کا قائل ہوا اور خدا اور رسول پر افترا باندھا۔ اس کے بہت سے خطوط میں الٹی
باتیں لکھی تھیں جو کفر تھا۔ بعض میں تھا کہ میں ہی نوح کی قوم کو ڈبونے والا اور عاد و
کو ہلاک کرنے والا ہوں اور اپنے مریدوں سے کہتا کہ تم نوح، موسیٰ اور محمد ہو ان
روحیں میں نے تمہارے بدن میں لوٹا دی ہیں۔"

ابوعبدالرحمٰن السلمی (المتوفی 1025ء) متقدمین صوفیا میں معتبر نام رکھتے ہیں۔ چو
صدی ہجری میں عالم اسلام میں جو تصوف رائج ہوا اس پر آپ کی گہری چھاپ رہ
طبقات الصوفیہ جو دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکی کے مصنف تھے لکھتے ہیں کہ "م
کا حسین بن منصور کے معاملے میں اختلاف ہے اکثر مشائخ کے خیال میں تصوف میں ا
کوئی مقام نہیں ہے لیکن اکثر اہل علم جن میں ابوالعباس بن عطاء، ابوعبداللہ محمد خفیف ا
ابوالقاسم نصر آبادی شامل ہیں نے حسین بن منصور کی نہ صرف تعریف کی ہے بلکہ خفیف
نے انہیں عالم ربانی قرار دیا ہے۔" انہوں نے منصور بن عبداللہ کی روایت بھی نقل
ہے جس میں انہوں نے شبلی کو یہ کہتے سنا کہ "میں اور منصور ایک ہی چیز ہیں مگر اس
اپنے آپ کو ظاہر کر دیا اور میں نے خود کو پوشیدہ رکھا۔" وہ لکھتے ہیں کہ "حلاج صوفیہ
رنگ میں شعر کہتا تھا اس کے قتل کے بعد صوفیہ میں تو اس کے متعلق اختلاف رونما
لیکن فقہا اس بات پر متفق تھے کہ وہ کفر کی حالت میں قتل ہوا۔ اس کے حسب ذیل اش

سے عقیدہ حلول کی تائید ہوتی ہے۔

- تیری روح میری روح میں اس طرح آمیختہ ہوگئی جس طرح عنبر مشک خالص میں یا شراب صاف پانی میں مل کر ایک ذات ہو جاتی ہے۔ جب کوئی شے تجھے مس کرتی ہے تو وہ مجھے مس کرتی ہے اور تو' میں ہے۔ ہم جدا نہیں ہو سکتے۔ تو ہر حال میں "میں" ہے۔
- پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی ناسوتی شکل میں، اپنی منور لاہوتی ذات کو ظاہر کیا ہے اور پھر وہ اپنی مخلوقات کے سامنے ایک کھانے اور پینے والے انسان کی شکل میں ظاہر ہوا۔

تاریخ فخری میں ابن طقطقی (948ء) میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"حلاج کی شخصیت مشرقی ادبیات اور خاص کر تصوف کی تاریخ میں ایک متنازعہ فیہ شخصیت ہے۔ عام طور پر حلاج کو عاشق خدا سمجھا جاتا ہے جو فنا فی اللہ ہو اور انا الحق کہتے ہوئے دار پر جان دے دی لیکن تعجب ہے کہ تمام مورخ اس پر بھی متفق ہیں کہ حلاج نیرنگ شعبدہ بازی میں بہت مشاق تھا۔

سرزمین شام میں بیضا کے گاؤں میں جہاں وہ پیدا ہوا، اس کی کرامات مشہور ہوئیں کہ اس گاؤں میں انگور دس مثقال کے ہوتے ہیں اور سیب کی گولائی دو بالشت اور یہ سب حلاج کی کرامات بتائی جاتی تھیں۔ یہ مشہور تھا کہ وہ شیر پر سوار ہو کر سانپ کو اپنا کوڑا بناتا تھا اور سردیوں کے پھل گرمیوں میں اور گرمیوں کے پھل سردیوں میں پیش کرتا تھا۔ ہاتھ ہلاتا تو اشرفیوں کی بارش ہوتی جن پر قل ھو اللہ لکھا ہوتا' ابوعبداللہ محمد بن حنیف نے بیان کیا ہے کہ قید خانے میں جب وہ نماز کے لیے اٹھتا تو اس کی بیڑیاں اتر جاتی تھیں کسی نے کہا تم اپنے آپ کو آزاد کیوں نہیں کر لیتے اس پر حلاج نے کہا کہ

میں کوئی قیدی تھوڑا ہی ہوں۔ فقہا نے حلاج کو کہا کہ "اناالحق" کی بجائے "سو الحق" کہو۔ اس نے جواب دیا ہاں "ہمہ اوست" اس پر جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسے مار ڈالو۔

ایسی ہی اور کئی کرامات حلاج کے متعلق مشہور ہیں لیکن کچھ تاریخ دان ایسے بھی ہیں جنھوں نے اسے شعبدہ باز کہا کہ وہ راہ میں گڑھے کھود کر کہیں پانی، کہیں میوہ چھپا دیتا تھا اور پھر اپنے مریدوں کو ساتھ لے جا کر انہیں اپنی کرامات بتا کر رام کرتا تھا۔"

ابن ندیم (م 998ء) نے "الفہرست" حسین بن منصور کے قتل کے 65 سال بعد (990ء) میں تالیف کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

حلاج ایک حیلہ گر اور شعبدہ باز تھا اس نے صوفیہ کے طریقے اختیار کر رکھے تھے۔ ان کے الفاظ بولتا اور ہر علم کا دعویٰ کرتا تھا حالانکہ وہ اس سے خالی تھا۔ علم کیمیا البتہ کچھ جانتا تھا۔ اپنے مریدوں میں بیٹھ کر الوہیت کا مدعی اور حلول کا قائل تھا۔ سلاطین کے سامنے مذہب شیعہ ظاہر کرتا اور عوام کے سامنے صوفیوں کا مذہب اور بیچ بیچ میں یہ بھی دعویٰ کرتا جاتا کہ الوہیت اس میں حلول کر گئی ہے اور وہ خدا ہے۔ خدائے پاک برتر۔ وہ شہر بشہر گھومتا پھرتا تھا۔ جب اسے گرفتار کیا گیا تو ابوالحسن علی بن عیسیٰ کے سپرد کیا گیا۔ اس نے اس کے ساتھ مناظرہ کیا تو دیکھا کہ وہ علوم قرآن و سنت، حدیث، شعر اور علوم عرب سے قطعی نابلد ہے۔ اس پر علی بن عیسیٰ نے اس سے کہا کہ تمہارے لیے اپنے عبادات و فرائض کا علم حاصل کرنا اس قسم کی مراسلہ نگاری سے کہیں زیادہ مفید ہے کہ جس کی تو خود بھی سمجھ نہیں رکھتا۔ تم پر افسوس ہے۔ تم لوگوں کے لیے کب تک یہ مہملات لکھتے رہو گے تم لائق سرزنش و تنبیہہ ہو بعد ازاں اس کے حکم کے مطابق پولیس کی نگرانی میں اسے پہلے مشرقی جانب اور پھر اسی طرح مغربی جانب لٹکا دیا گیا۔ اس کے بعد اسے دارالسلطنت میں لایا گیا اور زنداں

میں ڈال دیا گیا۔ اس نے اپنی چرب زبانی سے علی بن عیسیٰ کو اپنے قریب کر لیا اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ حسین حق بجانب ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق آغاز کار میں وہ لوگوں کو آل محمد ﷺ کی رضامندی حاصل کرنے کی دعوت دیتا تھا۔ اس پر اس کی مخبری کی گئی اور گرفتار کر کے کوڑے لگائے گئے۔ کہتے ہیں کہ ابو سہل نوبختی نے اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔ تو اس نے اس کے فرستادہ سے کہا کہ میں خود ایک سربراہ مذہب ہوں اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ میرے متبع ہیں۔ ایک روز اس نے اپنے ہاتھ کو حرکت دی تو لوگوں پر مشک جھڑنے لگا۔ دوسری مرتبہ ہاتھ ہلایا تو درہم بکھرنے لگے۔ اس پر حاضرین میں سے ایک فہیم اور عقل مند شخص نے کہا۔ یہ تو میں وہی درہم دیکھ رہا ہوں جو یہاں رائج ہیں۔ میں اور یہ تمام لوگ جو میرے سامنے بیٹھے ہیں اس صورت میں تم پر ایمان لائیں گے جب تو ہمیں ایک ایسا درہم دکھائے گا جس پر تمہارے اور تمہارے باپ کا نام درج ہو۔ اس نے کہا یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس قسم کا کوئی درہم تو بنا ہی نہیں! اس نے کہا جو شخص غیر حاضر شے کو حاضر کر سکتا ہے وہ اس شے کو بنا بھی سکتا ہے جو ابھی تک نہیں بنی۔ پھر اسے حاجب کے سپرد کیا گیا تو اس نے اس کو بھی بہکایا۔ اس کی کتابوں میں لکھا ہے کہ "میں ہی قوم نوح کو غرق اور عاد و ثمود کو ہلاک کرنے والا ہوں۔ وہ کم کھاتا تھا بکثرت نمازیں پڑھتا تھا اور ہمیشہ روزہ رکھتا تھا۔ نفر شوری، اسے شیخ صالح کہتے تھے۔"

ابن حوقل 975ء میں زندہ تھے اور ان کا سفرنامہ 944ء یعنی ابن منصور کے قتل سے 21 سال بعد سے شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ:

"حسین بن منصور حلاج نداف تھے۔ زہد و تصوف کے مدعی تھے۔ درجہ بدرجہ ان کی حالت یہاں تک پہنچی کہ وہ کہنے لگے جو شخص

اطاعت الٰہی میں جسم کو درست کرے اور اپنے قلب کو نیک اعمال
میں مشغول رکھے اور لذات دنیوی سے کنارہ کش ہو جائے اور اپنے
نفس کو خواہشوں سے باز رکھے وہ مقربین اور پاک فرشتوں تک
پہنچ جاتا ہے۔ پھر صفائی کے درجہ میں بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھتا
ہے کہ اس کی طبیعت بشریت سے پاک ہو جاتی ہے اور بشریت کا اس
میں کوئی شائبہ نہیں رہتا۔ تب خدا کی روح اس میں حلول کر جاتی
ہے۔ جس طرح حضرت عیسیٰ میں حلول کرتی تھی۔ اس وقت ہر چیز
اس کے تابع فرمان ہو جاتی ہے وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جہاں
تک خدا کا حکم نافذ ہو سکتا ہے اس کا بھی ہوتا ہے اس وقت اس کے
تمام افعال خدا کے افعال ہوتے ہیں۔ حلاج یہ سب کرتا تھا اور
لوگوں سے کہتا تھا کہ یہ درجہ اس کو حاصل ہو گیا ہے۔

ابو علی ابن مسکویہ (م 1034ء) حلاج کے قتل کے تقریباً چالیس پچاس سال بعد
ہوئے۔ وہ اپنی تصنیف تجارب الامم میں لکھتے ہیں کہ:

"لوگوں نے یہ کہہ کر حامد وزیر مملکت کی توجہ اس کی طرف مبذول
کروائی کہ یہ شخص عوام کو گمراہ کر رہا ہے کیونکہ لوگ اس کے
بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔
جنات اس کے قبضہ میں ہیں اور انبیاء کی طرح معجزے دکھا سکتا
ہے۔ 922ء میں جب حامد نے اس کے چند مریدوں کو گرفتار کیا تو
انہوں نے تسلیم کیا کہ وہ اسے خدا سمجھتے ہیں کیونکہ وہ مردوں کو
زندہ کر سکتا ہے۔ جب حلاج کو قید خانے میں اس بات کی خبر پہنچی تو
اس نے ان سب باتوں کا انکار کیا۔ اس کے بعد خراسان میں اس
کے دو مبلغین کو گرفتار کیا گیا جن کے نام ابن بشر اور شاکر تھے ان
کے قبضے میں حلاج کی تحریریں دستیاب ہوئیں اور یہ تحریر بھی ملی کہ

حج کرنے کے لیے مکہ جانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے حج گھر میں
بھی ہو سکتا ہے اور یہ بات حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں سے
اخذ کردہ بتائی گئی۔ مخفی طور پر اس کے عقائد کی جب تفتیش کروائی
گئی تو معلوم ہوا کہ اس کی طرف جن ادعائے الوہیت کا انتساب کیا
جاتا ہے وہ سچ ہے۔ اس کے بعد بہت سے اس کے قدیم حباب اور
رفقائے سفر ملے جنہوں نے ہفوات اور خیالات کی تشریح کی۔ کبھی
صرف صلاح و تقویٰ کا مدعی تھا کبھی اس سے آگے بڑھ کر مجددیت کا
دعویٰ کر بیٹھا اور اگر زیادہ جاہلوں کا مجمع ملتا تو خدا بن بیٹھتا۔

ابو ریحان البیرونی (975ء تا 1053ء) اپنی تصنیف آثار الباقیہ میں حسین بن منصور
کے عقائد کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ: "مقنع کے بعد ایک صوفی منش شخص حسین بن
منصور حلاج پیدا ہوا' پہلے یہ مہدی بنا۔۔۔ وہ ایک شعبدہ باز اور پر فریب آدمی تھا۔ ہر
مذہب اور ہر فرقہ کے آدمی کے سامنے اسی فرقہ اور مذہب کا خود کو بتاتا تھا' پھر یہ دعویٰ کیا
کہ اس میں روح الٰہی حلول کر گئی ہے اور خود کو خدا کہنے لگا۔ خط میں اپنے پیروؤں کو
لکھتا' از خدائے ازلی بہ بندہ فلاں' اس کے مرید جواب میں لکھتے' اے وہ ذات جو ہر زمانہ
میں مختلف قالب اختیار کرتی رہی ہے اور اب حسین بن منصور کے قالب میں ہے۔"

حافظ ابو بکر احمد بن علی الخطیب البغدادی <955ء تا 1076ء> تاریخ بغداد میں لکھتے
ہیں کہ حسین بن منصور کے بارے میں صوفیاء کرام کا اختلاف ہے۔ اکثر حلاج کو صوفیا میں
شمار نہیں کرتے۔ متقدمین صوفیاء میں سے ابوالعباس بن عطاء بغدادی' محمد بن خفیف
شیرازی اور ابراہیم بن محمد النصرابازی نیشاپوری نے حلاج کو صوفیاء کے گروہ میں شمار کیا ہے
اور ان کے کلام کو مدون کیا ہے۔ ابن خفیف نے حسین بن منصور کو عالم ربانی قرار دیا
ہے۔ جو لوگ حلاج کو صوفیاء کرام میں شمار نہیں کرتے وہ اس کو شعبدہ باز اور زندیق قرار
دیتے ہیں اور بعض اصحاب نے اس بارے میں غلو سے کام لیا ہے۔ وہ اپنی رائے قائم
کرتے ہوئے انہیں طریق تصوف میں حسن عبارت سے معمور قرار دیتے ہیں اور مختلف

آرا نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

○ انہیں ابو منصور محمد بن احمد بن علی نھاوندی نے خبردی' انہیں احمد بن محمد بن سلامتی روزی نے بتایا کہ میں نے فارس بغدادی کو کہتے سنا کہ ایک آدمی نے حسین بن منصور سے کہا کہ مجھے وصیت کیجئے تو آپ نے فرمایا اپنے نفس کا خیال رکھو اگر تو اسے حق کے ساتھ مشغول نہ رکھے گا تو وہ تجھے حق سے جدا کر دے گا' ایک دوسرے آدمی نے کہا کہ مجھے نصیحت فرمایئے تو آپ نے فرمایا جہاں تک واجب ہے حق کے ساتھ رہو۔

○ محمد بن عیسیٰ بن عبدالعزیز البزار نے ہمدان میں ہمیں بتایا کہ علی بن حسن صیقلی نے انہیں کہا کہ میں نے ابوطیب محمد بن فرحان کو کہتے سنا کہ انہوں نے حسین بن منصور سے سنا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ اولین و آخرین کے علوم کا مرجع چار کلمات ہیں۔

1- حب الجلیل (رب جلیل کی محبت)
2- بغض القلیل (دنیا سے نفرت)
3- اتباع التنزیل (قرآن مجید کی اتباع)
4- خوف التحویل (تغییر حال کا خوف)

○ ہمیں محمد بن علی نے خبردی کہ انہیں محمد بن حسین بن موسیٰ نیشاپوری نے خبردی کہ انہوں نے عبداللہ بن شاذ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے محمد بن علی کتانی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حسین بن منصور ہدایت حال میں مکہ آئے تو ہم نے کوشش کرکے ان کی پیوند زدہ گدڑی دیکھی اور اس میں سے ایک جوں پکڑی۔ اس اس کا وزن نصف دانق کے برابر تھا۔ کثرت ریاضت اور شدت مجاہدات کی وجہ سے انہیں اتنی فرصت نہ تھی کہ کپڑوں کو صاف کریں۔

○ مسعود بن ناصر نے مجھ سے بیان کیا کہ ابن باکوا شیرازی نے ہمیں بتایا' اس نے کہا کہ ابوعبداللہ حسین بن مراری بیان کرتے ہیں کہ ابویعقوب نہرجوری سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ حسین بن منصور مکہ معظمہ میں آئے تو سال بھر تک مسجد حرام کے صحن میں بیٹھے رہے۔ وضو اور طواف کے سوا کسی وقت بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتے تھے۔ وہ دھوپ اور بارش کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ شام کے وقت ان کے لیے ایک روٹی اور پانی کا کوزہ لایا جاتا تھا۔ تو وہ روٹی کے چار لقمے لے لیتے اور پانی کا ایک گھونٹ کھانے سے قبل اور ایک بعد میں نوش کرلیتے۔ باقی ماندہ روٹی کوزہ کے اوپر رکھ دیتے جو آپ کے پاس بیٹھا ہوا ہوتا تھا۔ اس روٹی کو اٹھالیتا۔

○ ابن باکوا نے کہا ہے ہمیں ابو الفوارس الجوزقانی نے بتایا' ہم سے ابراہیم بن شیبان نے بیان کیا' اس نے کہا کہ میرے استاد ابوعبداللہ مغربی' عمرو بن عثمان مکی کے پاس گئے اور کسی مسئلہ پر گفتگو شروع ہوگئی تو دوران گفتگو عمرو بن عثمان سے کہا' یہاں ایک جبل ابو قیس پر ایک ایسا جوان ہے جس کو ملنا چاہیے۔ ہم ان کے پاس سے اٹھ کر وہاں گئے تو دوپہر ہو چکی تھی ہم نے دیکھا کہ وہ جوان دھوپ میں جبل ابو قیس کے پتھر پر بیٹھا ہوا ہے۔ چٹان پر اس نوجوان کا پسینہ بہہ رہا ہے۔ پس جب ابوعبداللہ المغربی نے اس کی طرف دیکھا تو واپس لوٹ آیا۔ اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ واپس لوٹ جائیں۔ پس ہم پہاڑ سے اتر کر وادی میں آگئے اور مسجد حرام میں داخل ہوئے تو ابوعبداللہ المغربی نے مجھے مخاطب ہو کر کہا۔ اگر تم زندہ رہے تو تم دیکھو گے کہ اس نوجوان سے کیا پیش آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ایسی آزمائش میں مبتلا کرے گا کہ اس کو اس کی برداشت کی تاب نہ ہوگی کیونکہ یہ شخص اپنی غیردانش مندی سے اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری جتلائے بیٹھا ہے۔ ہم نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ حلاج ہے۔

ابوسعید الخبری نے مجھ سے بیان کیا کہ ہمیں محمد بن عبداللہ بن عبداللہ صوفی شیرازی نے خبر دی کہ میں نے ابوالحسن بن ابی توبہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے علی بن احمد حاسب سے سنا کہ میں نے اپنے والد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ خلیفہ معتقد نے مجھے بعض امور کی تحقیقات کے لیے ہندوستان بھیجا' کشتی میں میرے ساتھ ایک ایسا آدمی تھا جس کو حسین بن منصور کہتے تھے وہ مصاحبت کے لحاظ سے ایک عمدہ شخص تھا جب ہم کشتی سے اتر کر ساحل پر پہنچے اور قلی سامان کشتی سے کنارے پر اتارنے لگے تو میں نے اس سے پوچھا۔ تم کس کام کے لیے یہاں آئے ہو تو اس نے کہا کہ جادو سیکھنے اور لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کے لیے آیا ہوں۔ کنارے پر ایک کٹیا تھی جس میں ایک بوڑھا آدمی سکونت پذیر تھا اس سے حسین بن منصور نے پوچھا کیا تمہارے علم میں کوئی ایسا شخص ہے جو سحر جانتا ہو۔ بوڑھے نے سوت کی انٹی نکالی اور اس کا ایک کنارہ حسین بن منصور کے ہاتھ میں دے دیا۔ انٹی کو فضا مین پھینک دیا تو اس کا ایک لمبا تار بن گیا۔ اس کے بعد بڈھا اس تار پر چڑھ گیا' پھر اتر آیا اور ابن منصور سے کہا کہ کیا تم یہی کچھ چاہتے ہو۔ اس کے بعد وہ مجھ سے جدا ہو گیا اور ازاں بعد میں نے اسے بغداد میں ہی دیکھا۔

ہمیں اسماعیل بن احمد الحیری نے خبر دی ہے۔ ابوعبدالرحمٰن السلمی نے کہا کہ مزین نے کہا کہ میں نے حسین بن منصور کو کسی ایک سفر میں دیکھا۔ میں نے اس سے کہا کہاں جانے کا ارادہ ہے' اس نے کہا ہندوستان' تاکہ وہاں جادو سیکھوں اور اس کے ذریعہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلاؤں۔

ابوعبدالرحمٰن نے کہا کہ میں نے ابوعلی ہمدانی کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابراہیم بن شیبان سے حلاج کے بارے میں پوچھا اس نے کہا جو یہ پسند کرتا ہے کہ وہ حاسد اور بے ہودہ آدمی کا انجام دیکھے تو وہ حلاج کو دیکھ لے۔ دعاوی اور معارضات ہمیشہ اپنے اصحاب کے حق میں منحوس ہوتے ہیں جب سے ابلیس

نے "اناخیر منہ" کا دعویٰ کیا ہے۔

محمد بن حسین نے کہا میں نے ابراہیم بن محمد نصر آبازی سے سنا جب ان پر حلاج کا کلام روح نقل کرنے کی وجہ سے عتاب کیا گیا تو انہوں نے عتاب کرنے والے سے کہا کہ انبیاء علیہم السلام اور صدیقین کے بعد اگر کوئی موجود ہے تو وہ حلاج ہے۔

ہمیں ابن الفتح نے خبر دی کہ اسماعیل بن حسین نے بتایا۔ اس نے کہا کہ میں نے عبداللہ بن منصور کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے شبلی رحمۃ اللہ علیہ کو کہتے ہوئے سنا کہ میں اور حسین بن منصور ایک ہی چیز تھے۔ ابن منصور نے اپنے آپ کو ظاہر کر دیا جبکہ میں نے اپنے تئیں چھپائے رکھا اور کہا کہ میں نے منصور کو کہتے ہوئے سنا کہ بعض اصحاب نے کہا ہے کہ جب ابن منصور سولی پر لٹکائے گئے تو شبلی نے وہاں کھڑے ہو کر ابن منصور کو دیکھا اور کہا کہ کیا میں نے تم کو جہاں والوں سے نہ روکا تھا؟

مجھ سے مسعود بن ناصر نے بیان کیا۔ ہمیں باکوا شیرازی نے خبر دی کہ میں نے ابو زرعہ طبری کو کہتے ہوئے سنا کہ لوگوں میں حسین بن منصور کے رد و قبول کے بارے میں اختلاف ہے لیکن میں نے محمد بن یحییٰ رازی کو کہتے ہوئے سنا کہ میں عمرو بن عثمان کو لعنت کرتے ہوئے سنا اور وہ کہہ رہا تھا کہ اگر میں اس پر قابو پالوں تو میں اس کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دوں' میں نے پوچھا کہ شیخ نے ابن منصور کے بارے میں کس بناء پر یہ کہا تھا' اس نے کہا کہ میں نے جب قرآن مجید کی آیت پڑھی تو ابن منصور نے کہا کہ وہ بھی اس کی مثل بنا سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں ابوزرعہ طبری کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابو یعقوب الاقطع سے سنا کہ میں نے طریقت اور ریاضت کو دیکھ کر اپنی بیٹی کی شادی حسین بن منصور سے کر دی۔ تھوڑی دیر گزر جانے کے بعد مجھے علم ہو گیا کہ وہ ساحر اور فریب کار ہے۔ خبیث اور کافر ہے۔

ہمیں علی بن ابی علی نے خبر دی اس نے ابوالحسن ا بن یوسف ازرق سے بیان کیا کہ حسین بن منصور حلاج جب بغداد آیا تو وہ عوام اور رؤسا کو گمراہی کی طرف دعوت دیتا تھا اور اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اپنے طور طریق کو چھوڑ دیں۔

ابن باکوا نے کہا کہ ہم سے ابوعبداللہ مفلح نے بیان کیا کہ انہیں طاہر بن احمد تستری نے بیان کیا کہ مجھے حلاج کا معاملہ عجیب معلوم ہوا تو میں اس کی کنہ معلوم کرنے کے لیے مختلف حیلے اور جادو سیکھتا رہا۔ ایک دن میں اس کے پاس گیا۔ سلام کہہ کر ایک گھڑی بیٹھا رہا۔ ابن منصور نے مجھ سے کہا اے طاہر! اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈال جو تو فعل دیکھتا اور سنتا ہے وہ میرے فعل نہیں یہ مت گمان کر کہ وہ کرامت ہے یا جادو تو مجھ پر اصل حقیقت واضح ہو گئی۔

ہمیں ابراہیم بن مخلد نے خبر دی کہ ہمیں اسماعیل بن علی الخطبی نے اپنی تاریخ میں بتایا کہ حسین بن منصور کے عقائد عوام کے سامنے آئے۔ وہ قید کی صعوبتیں اٹھا رہا تھا یہ واقع علی بن عیسیٰ الادمی کی وزارت کے دور کا ہے۔ اس کی طرف زنادقہ کے عقائد منسوب تھے۔ شعبدہ بازی اور جادو سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا بوجھ اس کے کندھوں پر ڈالا گیا تھا۔ نیز اس کی طرف یہ بات بھی منسوب کی گئی تھی کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ علی بن عیسیٰ نے حسین بن منصور سے ان عقائد کا اظہار کیا اور سلطان متقدر باللہ کے پاس ان باتوں کو پہنچایا لیکن جو باتیں اس کی طرف منسوب کی گئی تھیں اس نے ان کا اقرار نہ کیا۔ بادشاہ نے اس کو سزا دی اور زندہ ہی کئی دن تک تختہ دار تک چڑھایا جاتا رہا اور ہر روز صبح کو ایک منادی کرنے والا اس کے عقائد کی تشہیر کرتا۔ پھر اس کو تختہ دار سے اتار دیا جاتا اور قید کی تاریک کوٹھڑی میں مقید کر دیا جاتا۔ وہ کئی سال قید کی کوٹھڑی میں مقید رہا اور ایک قید خانہ سے کسی دوسرے قید خانہ کی طرف منتقل کیا جاتا رہا۔ آخر کار سلطان کے گھر میں قید کر دیا گیا۔ اس نے

سلطان کے غلاموں کی ایک جماعت کو گمراہ کر دیا اور مختلف حیلوں، بہانوں سے ان کو اپنی طرف مائل کر لیا یہاں تک کہ وہ اس کے حامی و مددگار بن گئے اور اس سے مہربانی اور ترحم کا سلوک کرنے لگے۔ پھر مصنفین کی ایک جماعت بغداد آئی۔ اس کی دعوت کو قبول کیا۔ حسین بن منصور کے حالات سے آگاہ ہوئے انہیں بتایا گیا کہ اس نے دعوت ابوبنت کی ہے۔ اس کے اصحاب کے بارے میں بادشاہ کے پاس چغلی کھائی گئی۔ بادشاہ نے ان کو پکڑ لیا۔ اس کے اصحاب میں سے کسی ایک کے پاس اس کا ایک خط ملا۔ جو اس کے عقائد کی دلالت کرتا تھا۔ بعض نے اپنی زبان سے اس کا اقرار کر لیا اس کی خبر پھیل گئی اور لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس کو قتل کر دیا جائے، امیرالمومنین نے اس کو حامد بن عباس کے سپرد کرنے کا حکم دیا اور اس نے حکم دیا کہ اس کو عدالت کے سامنے پیش کیا جائے اور اس کے اور اس کے اصحاب کے مابین جو امور واقع ہوئے ہیں ان کو جمع کی جائے۔

شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ (1126ء تا 1240ء) چھٹی صدی ہجری کے مشہور فارسی شاعر اور صوفی تھے۔ وہ تصوف کے اسرار و رموز سے معمور تھے۔ انہوں نے 114 کے قریب کتابیں تصنیف کیں۔ دیوان اشعار کے علاوہ منطق الطیر، اسرار نامہ، الٰہی نامہ اور مصیبت نامہ ان کی مشہور مثنویاں ہیں۔ نثر میں تذکرۃ الاولیاء کا شمار وقیع تصانیف میں ہوتا ہے۔ تذکرۃ الاولیاء میں وہ حسین بن منصور پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ بھی عجب معاملہ رہا ہے اور اس کے واقعات بھی عجیب و غریب اور بے مثل اور صرف اسی سے مختص تھے۔ وہ سوز و اشتیاق میں ڈوبا ہوا اور آتش فراق کی شدت میں مست و بے قرار تھا۔ وہ شوریدہ روزگار اور صادق و پاک باز عاشق تھا۔ عظیم جدوجہد کا مالک، حیران کن ریاضت و کرامت کا حامل، عالی ہمت، رفیق قدر اوو زیبا سخن تھا۔ بہت سی تصانیف اس سے یادگار ہیں جن کی عبارات اوق اور کلمات مغلق ہیں۔ وہ

حقائق و اسرار اور معانی و معارف میں بڑا ہی کامل تھا۔ سخن میں ایسا صاحب فصاحت و بلاغت کہ شاید ہی کوئی اس کی ٹکر کا ہو۔ دقت نظر اور کیاست و فراست میں بے مثل، تمام زندگانی، آغاز سے آخر تک، گرفتار بلا رہا۔ بیشتر بڑے بڑے مشائخ نے اسے تسلیم نہیں کیا کہ ان کے مطابق اسے تصوف سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ البتہ ابن عطاء، عبداللہ خفیف رحمۃ اللہ علیہ، شبلی رحمۃ اللہ علیہ، ابوالقاسم نصر آبادی اور جملہ متاخر صوفیا نے بجز چند ایک کے اسے قبول کیا ہے۔ شیخ ابوسعید ابوالخیر، شیخ ابوالقاسم گورگانی، شیخ ابوعلی فارمدی اور امام یوسف ہمدانی اس سے بیزار ہیں۔ پھر کچھ ایسے بزرگ بھی ہیں جو اس کے بارے میں کسی قدر محتاط ہیں۔ مثلاً استاد ابوالقاسم قشیری، کہ ان کا کہنا ہے، کہ اگر وہ مقبول تھا ردخلق سے مردود نہ ہوگا اور اگر وہ مردود تھا تو قبول خلق سے اس کے حضور مقبول نہ ٹھہرے گا۔ بعض اصحاب اسے ساحر قرار دیتے ہیں اور بعض ارباب ظاہرہ کے نزدیک وہ کافر ہے۔ چند حضرات کے مطابق وہ اصحاب حلول میں سے تھا۔ کچھ کا کہنا ہے کہ اسے "اتحاد" سے محبت و رغبت تھی، لیکن جس کسی نے توحید کی خوشبو پالی ہو وہ کبھی معلول و اتحاد کے چکر میں نہیں پڑ سکتا اور جو کوئی ایسی بات کرتا ہے وہ توحید کے معاملے میں بے خبر محض ہے اس مطلب کی توضیح کے لئے طوالت درکار ہے جبکہ یہ کتاب (تذکرا الاولیاء) اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

شیخ فرید الدین عطار لکھتے ہیں کہ : "حسین کو جب جنید بغدادیؒ سے اپ مسائل کا کوئی جواب نہ ملا تو وہ آشفتہ و غمگین ہوئے اور بغیر اجازت حاصل ک واپس تستر چلے گئے۔ جہاں انہوں نے ایک سال قیام کیا اور اس دوران م انہیں اچھی خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ انہوں نے اہل زمانہ کی باتوں کو ک وقعت نہ دی جس کے نتیجے میں ان کے حاسد پیدا ہوگئے۔ عمرو بن عثمان خوزستان میں ان کے بارے میں کئی خطوط لکھے اور ان کے احوال کو ا

خوزستان کی نظروں میں بہت بری صورت میں پیش کیا چنانچہ یہاں بھی دل گرفتہ ہوئے۔ تنگ آکر انہوں نے صوفیانہ لباس اتار پھینکا اور قبا پہن کر اہل دنیا کی صحبت اختیار کرلی۔ لیکن اس سے ان کو خاص سکون نہ ملا نتیجتاً" وہ پانچ برس تک غائب رہے۔ یہ پانچ برس انہوں نے خراسان، ماوراء النہر اور سیستان میں بسر کئے۔ پھر وہ اہواز چلے گئے جہاں انہوں نے لوگوں کو وعظ و خطاب کیا، جس کی بنا پر انہیں عوام الناس کے ہر حلقے میں پذیرائی ہوئی۔ یہاں وہ مخلوق خدا کے اسرار بتاتے رہے۔ جس پر لوگوں نے انہیں "حلاج الاسرار" کے نام سے پکارنا شروع کردیا۔ اب انہوں نے گدڑی پہن لی اور کعبتہ اللہ کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر میں بہت سے گدڑی پوش ان کے ہمراہ ہولیے جب مکہ پہنچے تو یعقوب نہرجوری نے انہیں ساحر قرار دیا۔ وہاں سے پھر بصرہ آئے۔ یہاں سے اہواز پہنچے جہاں اس خیال کا اظہار کیا کہ میں بلاد شرک کی طرف جا رہا ہوں گا کہ لوگوں کو خدا کی طرف بلاؤں۔ چنانچہ وہ ہندوستان چلے گئے۔ وہاں سے ماوراء النہر آئے، پھر چین کا رخ کیا اور لوگوں کو خدا کی طرف بلایا۔ ان لوگوں کے لیے انہوں نے کچھ کتابیں بھی لکھیں۔ جب وہ اقصائے عالم کا سفر طے کرکے واپس لوٹے تو مختلف خطوں اور ملکوں کے لوگوں نے انہیں اپنے خطوط میں مختلف القاب سے خطاب کیا مثلاً ہند نے "ابوالمغیث" اہل خراسان نے "ابوالطہر" اہل فارس نے "ابوعبداللہ" اہل خوزستان نے "حلاج الاسرار" اہل بصرہ نے "مخبر" اور اہل بغداد نے "مصطلم" کے لقب سے پکارا۔ غرض کہ ان کے بارے میں بے شمار اقوال مشہور ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد عازم مکہ ہوئے اور دو سال تک وہاں مجاور حرم کی حیثیت سے مقیم رہے۔ جب واپس آئے تو ان کی حالت متغیر ہوچکی تھی اور وہ پہلی سی حالت میں نہ رہی تھی۔ اب وہ لوگوں کو کچھ ایسے الفاظ سے پکارتے اور بلاتے تھے کہ کسی کے پلے کچھ نہ پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کے مطابق انہیں پچاس شہروں سے نکال دیا گیا اور ان پر

کچھ ایسا دور گذرا کہ اس سے بڑھ کر حیران کن کوئی دور نہ ہوگا۔ وزیر دربار علی بن عیسیٰ کو بھی ان سے بدگمان کر دیا گیا اور آخر خلیفہ نے انہیں قید کرنے کا حکم دیا۔ انہیں ساحر یا حلولی جاننا تحقیق کے خلاف ہے وہ موحد اور ولی کاملی تھے۔

بہرحال بغداد میں زندیقیوں کا ایک گروہ تھا جو حلول اور اتحاد دونوں اعتقادات کی نسبت سے خود کو "حلاجی" کہلاتا اور منصور حلاج سے خود کو منسوب کرتا تھا۔ یہ لوگ اس کی باتوں کو نہ سمجھ سکے اور محض تقلید کے طور پر مرنے اور جلنے پر فخر کرتے تھے چنانچہ بلخ میں دو ایسے ہی آدمیوں کے ساتھ وہی واقعہ پیش آیا جو حسین (حلاج) کو پیش آیا تھا' لیکن اس واقعہ میں تقلید ضروری نہیں ہے۔ مجھے تعجب ان لوگوں پر ہے جو اس بات کو تو درست سمجھتے ہیں کہ کسی درخت سے "اناللہ" کی آواز آئے اور درخت درمیان میں نہ ہو لیکن ان کے نزدیک یہ روا کیوں نہیں ہے کہ حسین سے "اناالحق" کی آواز آئے اور حسین درمیان میں نہ ہو۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان سے بات کی اور یہاں نہ حلول کا معاملہ ہے اور نہ اتحاد کی بات۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ حسین منصور حلاج کوئی اور شخص ہے اور حسین منصور ملحد کوئی اور' جو محمد زکریا کا استاد اور ابو سعید قرمطی کا دوست تھا۔ یہ حسین (متاخر الذکر) ساحر تھا۔ اول الذکر حسین منصور کا تعلق فارس کے علاقہ بیضا سے تھا' اس کی پرورش واسط میں ہوئی۔ بقول ابوعبداللہ خفیف کے حسین منصور عالم ربانی تھا اور حضرت شبلی کا کہنا ہے کہ میں اور حلاج ایک ہی چیز ہیں۔ فرق صرف یہ ہے لوگوں نے مجھے دیوانہ قرار دے دیا اور یوں میری نجات ہوگئی لیکن حسین کو اس کی عقل نے ہلاک کر ڈالا۔ سو اگر وہ مطعون ہوتا تو یہ بزرگ اس کے بارے میں یہ کچھ نہ کہتے اور اس کی برائت کے لیے ہمارے واسطے یہی دو گواہ کافی ہیں۔

منصور حلاج ہمیشہ عبادت و ریاضت میں مگن رہتا اور معرفت و توحید کی باتیں کرتا۔ اہل صلاح و تقویٰ کی صحبت میں رہتا اور پیرو شرع و سنت تھا اور یہ بات اس سے ظاہر ہوتی رہی لیکن پھر بھی بعض مشائخ نے اس سے دوری اختیار کیے رکھی' جس کا سبب دین و مذہب نہ تھا بلکہ اس کی سرمستی ان کی ناراضی کا باعث بنی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حسین دن رات میں چار سو رکعت نماز ادا کرتا اور اس بات کو اس نے اپنے اوپر لازم کر رکھا تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ جس مرتبہ کو تو پہنچا ہوا ہے اس میں اس قدر زحمت و تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس نے جواب دیا کہ دوستوں کے حال پر نہ تو راحت اثر کرتی ہے اور نہ رنج' اس لیے کہ دوست تو فانی صفت ہوتے ہیں۔ یہ رنج و راحت ان پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

بیان کرتے ہیں کہ پچاس سال کی عمر میں ایک مرتبہ کہنے لگا کہ میں نے اب تک کوئی مذہب اختیار نہیں کیا' لیکن تمام مذاہب سے جو چیز دشوار ترہے میں نے وہ اختیار کی ہے یعنی نفس پر اختیار۔ چنانچہ آج تک جب کہ میں پچاس برس کا ہو چکا ہوں' میں نے جو نماز پڑھی ہے غسل کر کے پڑھی ہے۔

روایت ہے کہ آغاز میں جب وہ ریاضت کیا کرتا تھا تو اس کے پاس ایک گدڑی تھی جسے اس نے بیس سال تک اوڑھے رکھا اور کبھی خود سے علیحدہ نہ کیا' آخر لوگوں نے سختی کر کے وہ گدڑی اتار لی۔ اس گدڑی میں بے شمار کاٹنے والے کیڑے پڑ چکے تھے۔ ان میں سے ایک کیڑے کا وزن کیا گیا تو وہ تین رتی نکلا۔

کہتے ہیں کہ کوئی شخص ان کے پاس آیا۔ وہاں اس نے ایک بچھو دیکھا جو اس کے گرد رینگ رہا تھا' اس شخص نے اسے مارنے کا ارادہ کیا تو حلاج نے اسے اس حرکت سے باز رکھتے ہوئے کہا کہ بارہ برس ہو چکے ہیں وہ ہمارا ندیم

چلا آ رہا ہے اور ہمارے گرد رینگ رہا ہے۔

منقول ہے کہ رشید خرد سمرقندی عازم کعبہ ہوا تو راستہ میں مجلس وعظ بھی برپا کرتا جاتا۔ اس رشید کی روایت کے مطابق حلاج چار سو صوفیوں کے ہمراہ کسی جنگل کی طرف نکل گیا۔ جب چند روز گزر گئے اور انہیں کھانے کو کچھ نہ ملا تو حسین سے کہنے لگے۔ ہمیں بھنی ہوئی سری چاہیے۔ اس نے کہا بیٹھ جاؤ۔ پھر وہ ہاتھ پیچھے کی طرف لے جاتا اور ایک ایک بھنی ہوئی سری کے ساتھ دو دو روٹیاں ان صوفیاء کو دیتا جاتا اور یوں اس نے چار سو بھنی ہوئی سریاں اور آٹھ سو روٹیاں ان لوگوں میں تقسیم کیں۔ اس کے بعد وہ اس سے کھجور کے خواہاں ہوئے جس پر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا مجھے جھاڑو۔ اس طرح کھجوریں اس سے جھڑنے لگیں۔ یہاں تک کہ سب نے خوب جی بھر کر کھائیں۔ اب سلسلہ کچھ ایسا چلا کہ جس جگہ بھی کسی کانٹے دار جھاڑی سے وہ اپنی پشت لگاتا اس کھجور کا پھل آ جاتا۔

بیان کرتے ہیں کہ صحرا میں ایک جماعت نے اس سے انجیر کی خواہش کی اس نے ہاتھ اوپر بلند کیا اور تازہ انجیر کا ایک تھال ان لوگوں کے سامنے رکھ دیا ایک مرتبہ انہوں نے اس سے حلوہ مانگا تو گرم گرم حلوے کا تھال ان کو پیش دیا۔ لوگوں نے کہا یہ حلوہ تو بغداد کے علاقے "باب الطاق" کا ہے حسین نے جواب دیا کہ ہمارے لیے بغداد اور بادیہ (جنگل) ایک ہی ہے۔

ایک مرتبہ اس کے ساتھ چار ہزار آدمی صحرا سے ہوتے ہوئے کعبہ تک گئے اور ایک سال وہ تیز دھوپ میں کعبہ کے سامنے ننگا کھڑا رہا جس کے نتیجے میں اس کے اعضا سے پسینہ بہہ بہہ کر پتھر پر گرتا جاتا۔ اس کی کھال پھٹ گئی لیکن وہ وہاں سے نہ ہلا۔ لوگ ہر روز ایک روٹی اور پانی کا کوزہ اس کے پاس لا کر رکھ دیتے۔ وہ روٹی کے کناروں سے افطار کرتا اور باقی روٹی کوزہ آب کے اوپر رکھ دیتا۔ کہتے ہیں کہ اس کے ازار میں بچھو نے ڈیرا جما رکھا تھا۔ ایک موقع

اس نے عرفات کے مقام پر کہا یہ دلیل المتعرین (حیران ہونے والوں کے راہنما) اگر میں کافر ہوں تو میرے کفر میں اضافہ فرما اور جب اس نے دیکھا کہ ہر کوئی دعا مانگ رہا ہے تو اس نے بھی ریت کے ٹیلے پر سر رکھ دیا اور محو نظارہ ہوگیا۔ جب سب لوگ واپس چلے گئے تو وہ آہ بھرتے ہوئے بولا' بادشاہا' عزیزا! میں تجھے پاک جانتا ہوں اور پاک کہتا ہوں' اور تمام پاکی بیان کرنے اور تسبیح و تہلیل کرنے والوں سے اور تمام صاحبان پندار سے زیادہ کہتا اور تسبیح کرتا ہوں الٰہی تو جانتا ہے کہ میں تیرے شکر کے مقام پر عاجز ہوں۔ میری بجائے اپنا شکر کر کہ وہی شکر ہے اور بس۔

کہتے ہیں کہ ایک روز صحرا میں اس نے ابراہیم خواص سے کہا تو کس کام میں مشغول ہے' اس نے جواب دیا کہ توکل کے مقام پر توکل درست کر رہا ہوں۔ حسین بولا' تو تمام عمر تو شکم کی تعمیر میں رہا' توحید میں کب فنا ہوگا؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ اصل توکل تو نہ کھانے میں ہے اور تو ساری عمر توکل میں پیٹ ہی کی طرف متوجہ رہے گا تو توحید میں کیونکر فنا ہوگا۔ حسین سے پوچھا گیا کہ عارف کو وقت ہوتا ہے اس نے نفی میں جواب دیا کیونکہ اس کے مطابق "وقت" صاحب وقت کی صفت ہے اور جو کوئی اپنی صفت کے ساتھ آرام پکڑتا ہے وہ عارف نہیں ہوگا۔ اس کام مطلب تھالی مع اللہ وقت (میرے لیے خدا کے ساتھ ایک وقت ہے) اس سے پوچھا گیا کہ خدا تک راستہ کس قدر ہے؟ جواب دیا صرف دو قدم ہے اور تم پہنچ گئے اور وہ اس طرح کہ ایک قدم دنیا سے اٹھالو' اور ایک قدم عقبیٰ سے اور یہ تم پہنچ گئے مولیٰ تک۔ اس سے فقر کے بارے میں سوال کیا گیا تو بولا۔ فقر وہ ہے جو غیر اللہ سے مستغنی اور ناظر باللہ (اللہ کو دیکھنے والا) ہے اور کہا کہ معرفت عبادت ہے اشیاء کے دیکھنے سے اور باطن میں تمام کے ہلاک سے۔ نیز جب بندہ مقام معرفت تک پہنچتا ہے تو "غیب" اس پر وحی بھیجتا اور اس کے سر کو گنگ کر دیتا ہے تاکہ اس کے دل میں

بغیر خدا کے اور کوئی خیال نہ سمائے۔ نیز خلق عظیم وہ ہے کہ جب تم خدا کو پہچان چکے ہو تو لوگوں کی سختیاں تم پر اثر نہ کریں۔ توکل کے بارے میں اس نے یہ اظہار خیال کیا کہ توکل یہ ہے کہ آدمی جب شہر میں کسی کو کھانے کے معاملے میں اپنے سے بہتر پائے تو نہ کھائے اس کے نزدیک عمل کی کدورت کی آمیزشوں سے پاک ہونے کا نام اخلاص ہے۔

حسین کا کہنا ہے کہ زبان گویا خاموش دلوں کی ہلاکت کا باعث ہے اور گفتگو علل و اسباب میں اور افعال شرک میں بندھے ہوئے ہیں جبکہ "حق" ان تمام باتوں سے خالی اور مستغنی ہے۔ قال اللہ تعالیٰ "**وما یومن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون**" اس نے کہا کہ دیکھنے والوں کی بصیرتیں' عارفوں کے معارف' علماء ربانی کا نور اور نجات پانے والے سابق لوگوں کا طریق اور ازل و ابد اور جو کچھ درمیان میں ہے سب حدوث سے متعلق ہے۔ لیکن **لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید** اس کے مطابق "عالم رضا" میں ایک اژدہا ہے جسے "یقین" کہتے ہیں۔ اٹھارہ ہزار عالموں کے اعمال اس کے حلق میں اس طرح ہیں جیسے صحرا میں ذرہ۔ پھر اس نے بتایا کہ ہم سارا سال اس کی آزمائش و بلا کے اس طرح طالب ہوتے ہیں، جس طرح کوئی بادشاہ ہمیشہ ملک کی طلب میں ہوتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ خیال حق ایسی چیز ہے جس کی کوئی چیز برابری نہیں کر سکتی۔ یہ بھی اس کا قول ہے کہ مرید اپنی توبہ کے سائے میں اور مراد "عصمت" کے سائے میں ہے نیز مرید وہ ہے جس کا اجتہاد اس کے مکشوفات پر سبقت لے جائے اور مراد وہ ہے جس کے مکشوفات اس کے اجتہاد پر سبقت لے جانے والے ہیں۔ حسین کے نزدیک آدمی کا "وقت" سینہ آدمی کے دریا کا صدف ہے۔ ترک دنیا نفس کا زہد ہے ترک عقبیٰ دل کا زہد اور ترک خود (ذات) زہد جان ہے۔

اس سے صبر کے بارے میں پوچھا گیا' بولا' صبر یہ ہے کہ ہاتھ پاؤں کاٹ لیں

اور تختہ دار پر لٹکا دیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ یہ کچھ کیا گیا۔

ابوالحسن سید علی بن عثمان ہجویری رحمۃ اللہ علیہ (م 1078ء) پانچویں صدی ہجری کے مشہور صوفی بزرگ ہیں۔ آپ شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلی کے شاگرد تھے۔ انہوں نے روحانی کسب کمال کے لیے تمام اسلامی ممالک شام' عراق' بغداد' پارس' قہستان' آذربائیجان' طبرستان' خوزستان' کرمان' خراسان' ماوالنہر اور ترکستان وغیرہ کا سفر کیا اور وہاں کے اولیاء عظام' ابوالقاسم قیشری' ابوالقاسم گرگانی اور ابوسعید ابوالخیر کی روح پرور صحبتوں سے مستفیض ہوئے۔ کشف المحجوب کے علاوہ ان کی درج ذیل تصانیف بھی تھیں۔

1- منہاج الدین
2- کتاب النفاء و البقاء
3- اسرار الخرق و المئونات
4- کتاب البیان لاہل العیان
5- سحر القلوب
6- الرعایۃ بحقوق اللہ

انہوں نے ایک اور کتاب منصور حلاج کے کلام کی شرح اور ان کے عقیدے پر علیحدہ سے لکھی تھی لیکن یہ تمام کتابیں ناپید ہیں۔ ان کا قول ہے کہ فقر کا مرتبہ خدا کے نزدیک بہت بڑا اور افضل ہے اور فقیر کی تعریف یہ ہے کہ اس کے پاس کچھ نہ ہو۔ فقیر جتنا تنگ دست ہوگا اسی قدر حال میں زیادہ کشادہ اور اسرار منکشف ہوں گے۔ غنی باللہ فائل ہے اور اغناہ اللہ مفعول ہے۔

ان کی تصنیف کشف المحجوب تصوف کی اہم اور بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے جس میں آپ حسین بن منصور کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مستغرق معنی و مقتول دعویٰ ابوالمغیث الحسین بن منصور حلاج طریقت کے مستوں اور مشاقوں میں سے تھے۔ آپ بڑے قوی حال اور عالی ہمت تھے۔ ان کی شان میں مشائخ نے مختلف قصے بیان کئے ہیں۔ کسی گروہ کے نزدیک وہ

مردود ہیں اور کسی گروہ کے نزدیک مقبول۔ چنانچہ عمرو بن عثمان المکی، ابویعقوب نہرجوری، ابویعقوب اقطع، علی بن سہل اصفہانی اور ان کے گروہ کے ایک جزو نے آپ کو رد جب کہ ابن عطاء، محمد بن خفیف، ابوالقاسم نصر آبادی اور جملہ متاخرین نے انہیں قبول کیا ہے تاہم اس امر میں ایک گروہ نے توقف سے کام لیا ہے۔ جیسے جنید، شبلی، جریری اور حصری وغیرہ ایک اور گروہ نے سحر اور اس کے اسباب آپ سے منسوب کئے ہیں لیکن ہمارے زمانے میں، شیخ ابوسعید ابوالخیر، شیخ ابوالقاسم گرگانی اور شیخ ابوالعباس شقانی کے مطابق آپ صاحب سِر اور ایک کامل بزرگ تھے۔

استاد ابوالقاسم قشیری فرماتے ہیں کہ اگر وہ ارباب معانی و حقیقت میں سے تھے تو خلق کے مہجور کرنے سے مہجور نہیں ہوسکتے تھے اور اگر وہ مردود حق اور مقبول حق تھے۔ تو خلق کے مقبول بنانے سے وہ مقبول نہیں بن سکتے تھے۔ چنانچہ ہم ان کا معاملہ خدا کے سپرد کرتے ہیں اور جس قدر ان میں ہمیں حق کی نشانی کی یافت ہوتی ہے اس کے مطابق ہم ان کی بزرگی کو تسلیم کرتے ہیں۔

جملہ مشائخ میں سوائے چند کے کوئی ان کے کمال فضل، صفائے حال، کثرت اجتہاد اور ریاضت کا منکر نہیں ہے۔ بعض مردمان ظاہران کی تکفیر کرتے اور ان کے منکر ہیں اور ان کے احوال کو عذر و حیلہ اور سحر سے منسوب کرتے ہیں ان کے گمان میں حسین منصور حلاج، حسن بن منصور حلاج ہے۔ وہ ملحد بغدادی محمد زکریا کا استاد اور ابو سعد قرمطی کا رفیق تھا لیکن یہ حسین، جن کا ذکر ہم کر رہے ہیں، فارسی تھے اور بیضا کے رہنے والے تھے، مشائخ میں ان کا در ہجر دین و مذہب پر کسی طعن کے سبب سے نہیں بلکہ ان کے روزگار کی کیفیت کے باعث ہے۔

کیا نہیں دیکھتے کہ شبلی نے فرمایا ہے۔ "میں اور حلاج ایک ہی چیز ہیں میرے جنون نے مجھے مخلصی دلا دی اور اس کی عقل نے اسے ہلاک کر ڈالا

اگر وہ دین میں مطعون ہوتے تو شبلی یہ نہ کہتے کہ میں اور حلاج ایک ہی چیز ہیں۔

اسی طرح عبداللہ بن خفیف نے فرمایا کہ "وہ عالم ربانی ہیں" چنانچہ ان کے ضمن میں پیران طریقت و مشائخ کی ناخوشنودی اور رد ایک وحشت بار امر ہے۔ آپ کی تصانیف سے ظاہر ہے کہ اصول و فروغ میں آپ کے رموز و کلام مہذب ہیں۔

میں علی بن عثمان جلابی ہوں اور میں نے بغداد اور اس کے نواح میں پچاس رسالے ان کے تصنیف کئے ہوئے دیکھے ہیں۔ بعض رسالے خوزستان، فارس اور خراسان میں ہیں۔ ان میں میں نے ایسے سخن پائے جو مرید سے ابتداء میں سرزد ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض قوی تر، بعض ضعیف تر، بعض سہل تر اور بعض شنیع تر ہیں اور جب کسی پر حق کی نمود ہوتی ہے تو اس قوت حال میں اس کے ہاتھ فضل باری سے ایسی عبارت لکھی جاتی ہے کہ خود تعجب ہوتا ہے اور جب کوئی وہم والا اس کو سنتا ہے تو اس کو نفرت ہوتی ہے اور عقل اس کا ادراک نہیں کرسکتی، تب لوگ کہتے ہیں۔ یہ سخن عالی ہے۔ اس حال میں ایک گروہ اپنے جہل کے باعث منکر ہو جاتا اور دوسرا بھی جہل کی بنا پر اقرار کرتا ہے۔ اس واسطے کہ ان کا اقرار بھی انکار ہی ہوتا ہے۔ مگر جب اہل حقیقت و اہل بصیرت اسے دیکھتے ہیں تو اس پر عبارت آرائی اور تعجب میں مشغول نہیں ہوتے اور انکار و اقرار سے گریز کرتے ہیں۔

اور جو لوگ اس جواں مرد سے سحر منسوب کرتے ہیں وہ محال بات کرتے ہیں۔ اگرچہ صفت و جماعت کے اصول میں بھی سحر حق ہے، جیسے کہ کرامت، مگر حال کمال میں سحر کا اظہار کفر ہے جب کہ کرامت حال کمال میں معرفت ہے۔ چنانچہ ایک خداوند جل جلالہ کا غضب ہے اور ایک اس کا قرینہ۔ رضا اہل سنت و جماعت کے اہل بصیرت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایک مسلمان

ساحر یا ایک کافر مکرم نہیں ہو سکتا اور اضداد مجتمع نہیں ہو سکتے۔

○ حسین بن منصور حلاج جب تک رہے' لباس صلاح میں رہے' وہ نماز کے پابند' ذکر و مناجات بسیار کرنے والے' پیوستہ روزے رکھنے والے' تحمید میں مہذب اور توحید میں لطیف نکات بیان کرنے والے تھے۔ اگر ان کے افعال سحر ہوتے تو یہ سب کچھ ان کے سرزد ہونا محال ہوتا۔ پس درست ہوا کہ صاحب کرامات تھے اور کرامت سوائے ولی کے ظاہر نہیں ہو سکتی۔ بعض اہل اصول انہیں یوں رد کرتے اور ان پر اعتراض لاتے ہیں کہ ان کے کلمات سے امتزاج و اتحاد کے پہلو نکلتے ہیں لیکن یہ تشنیع ان کی عبارت پر ہے نہ کہ معنی پر۔ کیونکہ مغلوب سے امکان عبارت مشکل ہے۔ غلبہ حال میں اس سے صحیح بات کی ادائیگی نہیں ہو سکتی۔ نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عبارت مشکل ہو اور اس کا مقصود سمجھ میں نہ آئے اور اس سبب سے اس کے منکر ہو جائیں۔ سو قصور ان کے نہ سمجھ سکنے کا ہے نہ کہ اس عبارت کا۔

○ بغداد اور اس کے نواح میں ہم نے ایسے ملحدوں کو دیکھا ہے جو خود کو ان کا متولی کہتے ہیں اور اپنے زندقہ پر ان کا کلام محبت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ خود کو حلاجی کا نام دیتے ہیں۔ یہ ان کے امر میں اس قدر غلو کرتے ہیں جتنا رافضی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کرتے ہیں۔ تو خیال رہے کہ ایسے لوگوں کا کلام اقتدا کے لائق نہیں ہوتا کہ وہ مغلوب ہوتے ہیں۔ وہ اپنے حال میں متمکن نہیں ہوتے۔ اقتدا صرف ان کی کرنی چاہیے جو اپنے کلام میں متمکن ہوئے ہیں۔

○ وہ بحمد اللہ مجھے دل سے عزیز ہیں لیکن ان کا طریق مستقیم نہ تھا اور ان کا حال بھی مقرر نہ تھا اور ان کے احوال میں بسیار فتنہ ہے اور میں نے اپنی ابتدائے نمود میں ان سے براہین کے ضمن میں قوت حاصل کی ہے۔ میں اس سے پیشتر ان کے کلام کی شرح میں ایک کتاب لکھ چکا ہوں اس کتاب میں

دلائل و شواہد کے ساتھ کلام کی بلندی اور ان کی صحیح حالی کو ثابت کیا ہے۔ میں نے ایک اور کتاب میں' نام جس کا "منہاج" ہے' ان کو ابتداء سے انتہا تک یاد کیا ہے' اس جگہ بس اس قدر ان کا ذکر کر دیا ہے' پس ایسے طریق کی اقتدا سے احتراز لازم ہے کہ جس کی اصل اتنی احتیاط اور مشکل سے ثابت ہو۔ گمان اور راستی میں کبھی موافقت نہیں ہو سکتی۔ مگر کچھ ایسی چیز کے جویا ہیں جس کے طریق سے کجی پیدا ہو۔

○ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا: **الا لسنته مستطقات تحت نعلقها مستهلكات** "یعنی گفت گو کرتی زبانیں خاموش دلوں کے لیے ہلاکت کا باعث ہیں۔" ایسی عبارات آفت کا درجہ رکھتی ہیں اور حقیقت معنی میں بیکار ہیں۔ اس واسطے کہ جب معنی حاصل ہو جائیں تو وہ عبارت سے مفقود نہیں ہوتے اور جب معنی مفقود ہو جائیں تو عبارت کے ساتھ موجود نہیں ہو سکتے۔ ایسی عبارات سے طالب یہ سمجھتا ہے کہ لفظی اظہار ہی اصل حقیقت ہے اور یوں وہ ان سے ہلاکت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حجتہ الاسلام ابو حامد غزالی (م 1118ء) کو امام الحرمین ابو المعالی جوینی کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ وہ 25 برس تک نظام الملک طوسی کے مدرسہ نظامیہ میں مدرس رہے اور کیمیائے سعادت' احیا العلوم الدین' تہافتہ الفلاسفہ اور المنقذمین الضلال جیسی مایہ ناز کتابیں تصنیف کیں۔ انہوں نے اپنے اشعار میں کہا ہے کہ حلاج کا نعرہ انا الحق ایک وہمہ تھا اور محبت کی گہرائی سے انسان اپنے آپ اور محبوب میں فرق نہ کر سکا لیکن مشکواۃ الانوار میں تسلیم کیا کہ الوہی حسن نے حلاج کو اس نعرے پر اکسایا تھا۔ انہوں نے نام لئے بغیر حلاج کی دعاؤں کو اپنی تحریروں میں شامل کیا ہے۔

ابن العربی (م 1251ء) جن کا نظریہ وحدۃ الوجود ہمیشہ علمی نزاع کا باعث رہا نے حلاج کے مسئلہ حلول کو وحدت الوجود میں بدلا اور انا الحق کو حق میں تبدیل کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ "میں ہوں حقیقت۔ میں ہوں باری تعالیٰ کا عکس کائنات میں' میں آگ ہوں تم مجھے

چھو لو اور سمجھ لو کہ میں واقعی آگ ہوں۔"

ابن جوزی (م 1210ء) نے اپنی تصنیف المنتظم فی تاریخ الملوک والامم میں لکھا ہے
کہ جب حلاج کو دوبارہ گرفتار کیا گیا تو بغداد میں اسے ایک اونٹ پر بٹھا کر بازاروں میں اس
کی تشہیر یہ کہہ کر کرائی گئی کہ "آگاہ ہو جاؤ کہ یہ شخص قرامطہ کا داعی ہے۔" بعض لوگ
اسے جادوگر سمجھتے ہیں اور بعض اسے صوفی قرار دیتے ہیں۔ ہندوستان کا سفر اس نے جادو
حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ میں قرآن کا جواب لکھ سکتا
ہوں۔ وہ حلول، رجعت اور تجسم کی تعلیم دیتا تھا کبھی صوفیہ کا لباس پہنتا تھا اور کبھی علماء کا
وہ ہر مذہب کے آدم کا ہم خیال بن جاتا تھا۔"

محمد بن احمد الذہبی (م 1361ء) اپنی کتاب دلائل اسلام میں رقمطراز ہیں کہ حسین بن
منصور کچھ عرصے تک جنید رحمۃ اللہ علیہ، عمرو بن عثمان المکی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے صوفیہ کی صحبت میں
رہا لیکن اس میں خلوص نہ تھا اس لئے وہ دائرہ ایمان سے باہر نکل گیا۔ اس کے باوجود اکثر
متاخرین صوفیہ نے اس کی توصیف میں مبالغہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ حجتہ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ
نے بھی "مشکواۃ الانوار" میں اس کی حمایت کی ہے۔ ابو سعد نقاش نے اپنی تاریخ الصوفیہ
میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور اس پر سحر اور زندقہ کا الزام لگایا ہے۔

امام بن کثیر (م 1387ء) اپنی مایہ ناز تصنیف البدایتہ والنہایتہ فی التاریخ میں لکھتے
ہیں کہ حسین بن منصور ایک سال تک مسجد الحرام میں مشغول عبادت رہا۔ شبانہ روز میں
قرص کا کچھ حصہ کھاتا تھا اور دو گھونٹ پانی پیتا تھا۔ گرمیوں میں جبل ابو قبیس کے تپتے
ہوئے پتھروں پر بیٹھا رہتا تھا۔

ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں لکھا ہے کہ ماہ ذی قعدہ 309ھ میں وزیر نے
حلاج کے قتل کا حکم دیا تو جیل خانے سے اسے نکال کر باب الطاق کے پاس لے گئے اور
وہاں ہزاروں آدمی جمع ہو گئے۔ جلاد نے اس کے ہزار کوڑے لگائے پھر چاروں ہاتھ پاؤں
کاٹے پھر سر کاٹا اور بدن کو جلا دیا اور راکھ کو دجلہ میں ڈلوا دیا اور سر کو بغداد میں پل پر لٹکا
دیا۔ اس کے معتقد خیال کرتے تھے کہ وہ دنیا میں چالیس دن کے بعد رجوع کرے گا جب

نفاق سے دجلہ میں پانی بڑھ گیا تو یہ لوگ سمجھنے لگے کہ یہ حلاج کی راکھ کا اثر ہے اور بعض
معتقد کہتے تھے کہ حلاج نہیں مارا گیا بلکہ اس کی شبیہہ اس کے دشمنوں کے سامنے پیدا
ہو گئی تھی۔

امام الحرمین جوینی نے کتاب الشامل فی اصول الدین میں لکھا ہے کہ ان تین شخصوں
نے باہم صلاح اور وصیت کی تھی کہ سلطنت کو لوٹ لو اور ممالک میں فساد پھیلا دو اور تمام
آدمیوں کی تالیف قلوب کر کے ان کو مرتد کر دو اور ہر ایک نے یہ چاہا تھا کہ ہر ایک ملک
میں یہ خرابیاں پھیلائے ان میں سے جنابی نے ممالک احسا میں اور مقنع نے ممالک ترک
میں اور حلاج نے علاقہ بغداد میں مکر و ارتداد کا جال بچھا دیا تھا اس لیے حلاج مروا ڈالا گیا۔
ابن **خلکان** کہتا ہے کہ اس روایت کی صحت میں کلام ہے اس لیے کہ یہ تینوں ایک
وقت میں جمع نہیں تھے اگرچہ جنابی کا اور حلاج کا ایک عہد تھا اس لیے ان کا جمع ہونا ممکن
ہے مگر یہ تحقیق نہیں کہ یہ دونوں جمع ہوئے اور باہم ملے یا نہیں۔

مراد جنابی نے لکھا ہے کہ حلاج ساحر تھا اور سحر میں نہایت مہارت اور کمال رکھتا تھا
اور عبداللہ بن املاک کوفی کا شاگرد تھا اور وہ ابو خالد کابلی کا تھا اور وہ ذرقانی یمامہ کا شاگرد
تھا اور ذرقانی وہ شخص تھا جس نے سجاح بنت حارث بن سوید تمیمہ سے جادو سیکھا تھا یہ
عورت کاہنہ تھی اور خاندان بنی عنبر سے تھی جو قبیلہ بن تمیم کی ایک شاخ ہے۔ حضرت
ابوبکر کے عہد میں اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا چنانچہ قبیلہ نبی تمیم اور قبیلہ تغلب اور
قبیلہ بنی ربعیہ کے لوگ اس کے مرید ہو گئے تھے۔ حلاج زہد و تصوف ظاہر کرتا تھا کرامات
دکھاتا تھا، گرمی کا میوہ سردی کے موسم میں، سردی کا گرمی کے موسم میں لوگوں کے واسطے
موجود کرتا تھا۔ لوگ جو کچھ گھروں میں کھاتے اور کرتے اور جو کچھ ان کے دلوں میں ہوتا
یہ بتا دیتا تھا اور اپنا ہاتھ ہوا میں پھیلا کر غیب سے درم پیدا کر دیتا جن پر یہ لکھا ہوتا "**قل
ھو اللہ احد**" اور ان کا نام دراہم قدرت رکھا تھا۔ لوگوں کے خیالات اس کی نسبت
مختلف ہو گئے تھے بعض کہتے تھے کہ اس میں جزو الہٰی نے حلول کیا ہے بعض اسے ولی
جانتے تھے بعض کہتے تھے کہ وہ شعبدہ باز، ساحر، کاہن اور جھوٹا ہے۔ حلاج برس روز تک

کے میں حجر اسود کے پاس رہا کبھی سائے میں نہیں گیا۔ دن بھر روزہ رکھتا شام کو پانی سے
افطار کرکے تین نوالے روکھی روٹی کھاتا اس کے سوا کچھ نہ کھاتا۔ بغداد میں آیا تو حامد وزیر
مقتدر عباسی سے لوگوں نے بیان کیا کہ حلاج خدائی کا دعویٰ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں
مردے کو زندہ کرتا ہوں اور جن میری خدمت کرتے ہیں اور جس چیز کے لیے میں کہتا
ہوں وہ اسے میرے پاس لے آتے ہیں اور میں معجزات انبیاء دکھلاتا ہوں۔ بہت سے لوگ
اس کے تابع ہوگئے اور اس کو خدا جاننے لگے اور ایک شخص نے بنی ہاشم میں سے دعویٰ
کیا کہ حلاج خود خدا ہے اور میں اس کا نبی ہوں۔ وزیر نے ان لوگوں کو بلا کر دریافت کیا
سب نے اقرار کیا کہ ہاں ہم حلاج کو خدا جانتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ وہ مردے کو زندہ
کرتا ہے اور جب حلاج کو بلا کر پوچھا تو وہ مکر گیا اور کہا کہ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور مجھ
پر تہمت کرتے ہیں میں دعویٰ خدائی کا نہیں کرتا اور نہ پیغمبری کا دعویٰ کرتا ہوں میں بندہ
خدا کا ہوں اور نماز و روزہ اور خیرات کرتا رہتا ہوں۔ وزیر نے قاضی ابو عمرو اور ابو جعفر اور
فقہا کی ایک جماعت کو حاضر کیا اور اس کے قتل کے بارے میں فتویٰ چاہا سب نے کہا
جب تک ہمارے نزدیک اس کا دعویٰ کرنا خدائی کا ثابت اور مستحسن نہ ہوگا ہم اس کے
قتل کا حکم نہ دیں گے۔ ایک شخص نے جو بصرے کا رہنے والا تھا نے کہا کہ میں حلاج کے
صاحبوں کو پہچانتا ہوں کہ جو شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں اور خلائق کو حلاج کی الوہیت
طرف دعوت کرتے ہیں اور یہ بصری بھی اصحاب حلاج سے تھا۔ مگر جب اس کو معلوم
کہ یہ ساحر ہے تو اس کو چھوڑ دیا اس نے ابو علی ہارون بن عبدالعزیز کاتب انباری کے پاس
آکر بیان کیا کہ حلاج نے اپنے کیش و مذہب کے موافق ایک کتاب لکھی ہے اور اس
زمانے میں حلاج سرائے سلطانی میں نصر حاجب کے پاس قید تھا اور حلاج کے دو نام تھے
ایک حسین بن منصور اور دوسرا احمد بن فارسی اور ایک خوبصورت لڑکی ایک مدت سے
سرائے سلطانی میں حلاج کے پاس آمد و رفت رکھتی تھی اس لڑکی کو وزیر کے پاس لائے
ابوالقاسم زنجی کہتا ہے کہ میں اس وقت وزیر کی خدمت میں حاضر تھا۔ ابو علی احمد بن
بھی حاضر تھا وہ لڑکی کمال فصیح اور خوش گو تھی۔ وزیر نے اس سے حال پوچھا۔ لڑکی نے

مجھے میرا باپ حلاج کے پاس لے گیا تھا۔ حلاج نے بہت سی چیزیں مجھے دیں اور کہا میں تجھ
کو اپنے بیٹے سلیمان کو کہ مجھے وہ سب فرزندوں نے زیادہ عزیز ہے دیا مگر شوہر و زن کے
درمیان اس وقت تک کوئی بات نہ آئے جب تک کہ تو اس روز روزہ رکھے اور پچھلے دن
میں کوٹھے پر جا کر خاکستر اور نمک سے روزہ کھولے اور بعد اس کے میرے پاس آکر جو کچھ
تو کہے گی میں تیری بات سنوں گا اور اس لڑکی نے یہ بھی کہا کہ ایک روز میں کوٹھے سے
اتری تو حلاج کی بیٹی میرے ساتھ تھی اور حلاج ہم سب سے پہلے کوٹھے سے نیچے اترا تھا۔
حلاج کی بیٹی نے مجھ سے کہا کہ تو میرے باپ کو سجدہ کر میں نے کہا کیونکر دوسرے خدا کو
سجدہ کروں۔ حلاج نے کہا وہ خدا آسمان کا ہے اور میں خدا زمین کا ہوں اور مجھے آگے بلا
کر اپنی جیب سے ایک ڈبہ مشک کا نکال کر دیا اور کہا کہ عورتوں کو خوشبو کی طرف اکثر
احتیاج ہوتی ہے اس کو لے اور اپنے کام میں لا اور پھر کہا کہ بوریے کا کونہ اٹھا اور جو کچھ
اس کے نیچے ہو اس کو لے لے میں نے بوریے کا کونہ اٹھایا دیکھا تو تازہ سکے کی اشرفیوں
سے تمام گھر بھرا ہوا ہے یہ دیکھ کر میں مبہوت سی رہ گئی۔ وزیر نے اس کے اصحاب حمید
اور سمیری اور محمد بن علی قبائی جو حلاج کے گھر میں چھپے ہوئے تھے کو طلب کیا۔ وہ اس گھر
میں سے ایک کتاب نکال کر لائے سونے سے لکھی ہوئی اور پارچہ دیبا میں لپٹی ہوئی تھی اور
اس میں اس کے اصحاب کے نام بھی لکھے ہوئے تھے۔ ایک ان میں سے ابن کیش تھا کہ وہ
حلاج کا شاگرد تھا غرض کہ وزیر نے اصحاب حلاج کو تلاش کرکے کہا کہ یہ دو شخص حلاج
کے داعی ہیں کہ خراسان میں خلق کو حلاج کی طرف دعوت کرتے ہیں اور حلاج کی کتاب
میں کئی خط تھے کہ ان دو شخصوں نے حلاج کو بھیجے تھے اور اس کے جواب میں حلاج کے
خطوط بھی تھے جن میں حلاج نے اپنا طریقہ دعوت ایسے رمز و کنایات میں لکھا تھا کہ بغیر اس
شخص کے جس نے لکھا اور جس کو لکھا گیا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ابوالقاسم زنجی کہتا
ہے کہ ایک روز میں اپنے باپ کے ساتھ وزیر کے پاس گیا اور وزیر اٹھ کر اس طرف جدھر
حلاج تھا گیا۔ ہم بھی اس طرف گئے اور ہارون بن عمر بھی حاضر تھا اور میرے باپ سے
بات کرنے میں مشغول تھا کہ ایک غلام نے اس کو اشارے سے بلایا۔ ہارون اٹھ کر اس

کے پاس گیا اور تھوڑی دیر کے بعد لرزتا اور کانپتا خوفناک رنگ رو زرد آیا۔ ہم نے یہ حالت دیکھ کر پوچھا کہ خیر تو ہے اس نے کہا کہ یہ غلام جس نے مجھے اشارے سے بلایا تھا حلاج پر محافظ ہے اور ہر روز اسے کھانا پہنچایا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے میں جو اس وقت اس کے واسطے کھانا لے کر گیا تو دیکھا کہ سارا گھر زمین سے چھت تک اس کے بدن سے بھرا ہوا ہے اور اتنی جگہ باقی نہیں کہ میں کھانا اس کے واسطے اس گھر میں رکھوں اور وہ غلام اس قدر ڈرا ہے کہ بخار چڑھ آیا ہے۔ وزیر نے اس غلام کو بلایا اور پوچھا۔ اس نے سب حال بیان کیا۔ وزیر نے کہا کہ تو حلاج کے سحر سے ڈر گیا۔ وزیر کو حلاج کے قتل پر بڑا اصرار تھا اس لیے اس سے وزیر نے بہت بحث کی مگر کوئی بات اس کے منہ سے ایسی نہ نکلی جو شرع اسلام کے خلاف سمجھی جاتی۔ آخر کار اس کتاب میں کئی ورق پائے جن میں مرقوم تھا کہ جب مسلمان حج کا ارادہ کرے اور وہ اس سے بن نہ پڑے تو اپنے مکان میں سے ایک کوٹھڑی پاک صاف منتخب کرے اس میں کوئی شخص نہ گھسے جب حج کے دن آئیں تو یہ شخص اس کا طواف کرکے جو کچھ حجاج عمل کرتے ہیں وہ بھی کرے پھر تیس یتیم اس کوٹھڑی میں جمع کرکے اچھا کھانا جو اس سے ہوسکے ان کو کھلائے اور کپڑے پہنا کر اور ہر ایک کو سات درم دے دے یہ شخص بمنزلہ اس شخص کے ہوگا جس نے حج کیا ہے۔ وزیر نے یہ کتاب قاضی ابو عمرو کو سنوائی۔ قاضی نے حلاج سے دریافت کیا کہ یہ تو نے کہاں سے لکھا ہے اس نے جواب دیا حسن بصری کی کتاب اخلاص سے۔ قاضی کے منہ سے نکل گیا کہ اے حلال الدم میں نے وہ کتاب مکہ میں پڑھی ہے اس میں یہ کہاں ہے۔ وزیر نے قاضی کا لفظ پکڑ لیا اور اصرار کرکے اس کے خون مباح ہونے کا فتویٰ لکھا لیا جب حلاج کو خبر ہوئی کہ میرے قتل پر فتویٰ لیا گیا ہے تو بولا میرا خون تم کو حلال نہیں۔ میرا دین اسلام ہے اور مذہب سنت ہے اور میری اس بات میں کتابیں موجود ہیں۔ میرے خون سے درگذرو اور خدا سے ڈرو مگر وزیر نے حلاج کی ایک نہ سنی اور خلیفہ سے اجازت لے کر بڑے عذاب کے ساتھ قتل کرایا۔"

سید محمد بن جعفر مکی حسنی مصنف بحر المعانی و بحر الانساب لکھتے ہیں کہ ابن عربی

صاحب فصوص کہتے ہیں کہ حسین بن منصور حلاج کو تجلی ذات حاصل تھی اور افراد کا مقام رکھتا تھا لیکن میں کہتا ہوں کہ اس کو تجلی ذات ہوتی تو ہرگز انا الحق نہ کہتا اور ایسا زبان پر نہ لاتا اس لیے کہ تجلی ذات میں محویت ہوتی ہے اور محو کو کیا معلوم کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں، میں کیا کروں کہ ابن عربی زندہ نہیں ورنہ میں یہ ان سے کہتا اور ضرور اپنی بات کی داد پاتا۔

لواح الانوار فی طبقات الاخبار معروف بہ طبقات کبر اشعرانی میں حضرت غوث اعظم کے حوالہ سے مذکور ہے کہ **کان رضی اللہ عنہ یقول عشر الحسین الحلاج عشرۃ فلم یکن فی زمنہ من یاخذ بیدہ** یعنی حضرت غوث اعظم فرمایا کرتے تھے کہ حسین حلاج کو ایک قسم کی لغزش ہوگئی تھی کوئی ایسا شخص اس زمانے میں نہ تھا جو حلاج کو سنبھال لیتا۔

مجدد الف ثانی نے عوارف الدنیہ میں کہا ہے کہ غلبہ حال سے پہلے کفر اور اسلام میں تمیز نہ کرنا جس طرح اہل شریعت کے نزدیک کفر ہے اہل حقیقت کے نزدیک بھی کفر ہے اگر کوئی اختلاف ہے تو غلبہ حال کی صورت میں ہے۔ اہل شریعت ایسے مغلوب الحال کو جو کفر و اسلام میں تمیز کرتا ہو کافر جانتے ہیں اور اہل حقیقت کے نزدیک وہ کافر نہیں یہی وجہ ہے کہ فقہا منصور حلاج کو کافر بتاتے ہیں اور اہل حقیقت تکفیر نہیں کرتے تاہم یہ بھی اسے ناقص جانتے ہیں۔ کاملین میں سے نہیں گنتے اور مسلمان حقیقی نہیں سمجھتے۔ منصور کا یہ شعر اس مطلب پر گواہ ہے۔

کفرت بدین اللہ و الکفر واجب
لدی و عندالمسلمین قبیح

یعنی میں نے دین الٰہی کے ساتھ کیا اور کفر میرے نزدیک واجب ہے اور مسلمان کے نزدیک مذموم ہے۔

تاریخ الخلفا میں سیوطی نے اور طبقات میں ذہبی نے 914ء کے حالات قلمبند کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خلفیہ مقتدر عباسی کے عہد میں حسین بن منصور حلاج کو اونٹ پر سوار کر

کے تشہیر کیا پھر اسے لٹکا کر منادی کرائی گئی کہ یہ فرقہ قرامطہ کا داعی ہے اور قید کر دیا یہاں تک کہ 922ء میں قتل کروا ڈالا اور لوگوں میں یہ بات مشہور ہوئی کہ یہ الوہیت کا مدعی تھا اور حلول کا قائل تھا جبکہ رئیس قرامطہ ابوطاہر سلیمان بن ابو سعید حسن بن بہرام قرامطی کے حوالہ سے کتب تواریخ میں لکھا ہے کہ حلاج ساحر تھا اور عبداللہ بن املاک کوفی کا شاگرد تھا۔

وکتور البیر نصری نادر اپنی تالیف "التصوف الاسلامی" میں لکھتا ہے: "واسطی نے کہا کہ میں نے ابن سریع سے کہا کہ حلاج کے متعلق تیری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا وہ حافظ قرآن تھا' اس کا عالم تھا' فقہ میں ماہر تھا' حدایث اخبار اور سنن کا عالم تھا' صائم الدھر اور قائم اللیل تھا۔ جب وعظ کرتا تھا تو اس پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ میں اسے کافر نہیں سمجھتا۔"

ڈاکٹر زکی مبارک اپنی تالیف "التصوف الاسلامی" جلد اول میں لکھتا ہے: "صوفیوں اور شیعوں کے بعض عقائد و نظریات کی اصل نصرانیت ہے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلاج اپنی اصل فطرت میں شیعہ تھا' اور وہ "حقیقہ محمدیہ" کے بجائے "حقیقہ علویہ" پر اعتقاد رکھتا تھا۔ اور اس نے اپنے مریدوں میں سے ایک کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں اسم اللہ کو اس تعویج کے ساتھ لکھا ہے کہ علی علیہ السلام بھی پڑھا جاسکتا ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ حلاج علیؓ کو اللہ اور وجود کے درمیان "صلہ" یقین کرتا تھا۔"

خطیب بغدادی نے سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ ہمارے پاس دستور سے ایک آدمی آیا۔ اس کے پاس ایک تھیلا تھا جسے وہ شب و روز اپنے پاس سے جدا نہیں کرتا تھا۔ جب لوگوں نے اس کے تھیلے کی تلاشی لی تو اس میں حلاج کا ایک خط نکلا جس کا عنوان یہ تھا "رحمٰن الرحیم کی طرف سے فلاں ابن فلاں کے نام۔" پس جب وہ خط حلاج کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا۔ ہاں یہ خط میرا لکھا ہوا ہے۔ یہ سن کر لوگوں نے کہا۔ "تو نبوت کا مدعی تو تھا ہی اب تو نے ربوبیت کا دعویٰ بھی کر دیا۔" یہ سن کر حلاج نے کہا۔ "میں نے

ربوبیت کا دعویٰ نہیں کیا لیکن یہ بات ہمارے نزدیک "عین الجمع" ہے اور دراصل اس کا کاتب اللہ ہی ہے۔ میں اور میرا ہاتھ بمنزلہ آلہ ہیں۔" حلاج اپنے آپ کو من صور علیؓ یا من صور محمدؐ سمجھتا تھا اور کہتا تھا کہ علیؓ یا محمدؐ تمام موجودات کے موجد ہیں۔ حلاج کے مرید یہ بھی کہتے تھے کہ جس طرح مسیح علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے بلکہ ان کی شبیہہ دوسرے پر ڈال دی گئی اسی طرح حلاج بھی مصلوب نہیں ہوا۔ **انہ لم یصلب وانما شبیہ لمن صلبوہ**" حلاج نظریہ وحدۃ الوجود یا نظریہ حلول کا معتقد تھا جیسا کہ اس کے بعض اشعار سے واضح ہے۔

مزجت . روحک فی روحی' کما
تمزج الخمرۃ بالماء الزلال
فاذا مسک شیئی مسی
فاذاانت انا فی کل حال

"اے محبوب! تیری روح میری روح میں اس طرح ملا دی گئی ہے جس طرح شراب صاف پانی میں ملا دی جاتی ہے پس جب کوئی شے تجھے مس کرتی ہے تو گویا مجھے مس کرتی ہے۔ پس ہر حال میں تو میں ہے۔"

مشہور مورخ ابن اثیر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ "ماہ رمضان 312ھ میں بغداد کے باب عامہ کے سامنے زنادقہ کی 204 کتابیں جلائی گئیں۔ ان میں سے بعض کتابیں حلاج کی مصنفہ تھیں۔ ان کتابوں سے بہت سا سونا ساقط ہوا جو ان پر چڑھا ہوا تھا اور اسی سال شاکر الزاہد بھی ظاہر ہوا جو حلاج کا ساتھی تھا اور بغداد کا باشندہ تھا۔ "سلمی" نے اپنی تایخ طبقات الصوفیہ میں لکھا ہے کہ شاکر حلاج کا خادم تھا اور حلاج کی طرح اس پر بھی قرامطی ہونے کی تہمت لگی ہوئی تھی۔

العمامتہ الصغریٰ میں حسین بن منصور کے ذیل اشعار درج ہیں۔

ترجمہ : اے بھیدوں کے بھید کہ وہ اتنا لطیف ہے کہ ہر زندہ شے کے بیان سے بالاتر ہے اور وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور ہر شی' سے ہر شی کے لیے ظاہر ہو رہا ہے۔

اے جملۃ لکل! تو میرا غیر نہیں ہے، پس میں کیسے خود اپنے آپ سے معذرت کروں؟"

کتاب اسرار اولیاء جس میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکر (م 1292ء) کے ملفوظات ان کے خلیفہ اور داماد حضرت بدر اسحقؒ نے ترتیب دیئے ہیں میں لکھا ہے کہ

○ اے درویش! اسرار و انوار کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے تاکہ اسرار دوست کو کوئی ٹھکانہ اور قرار ملے اور اگر خدانخواستہ اسرار دوست میں سے راز کا ایک ذرہ بھی ظاہر ہو جائے تو پھر منصور حلاج کی طرح از خود رفتگی کا طاری ہو جانا ضروری ہے۔ اس لیے دوست ہو جانے کے بعد جو راز بھی عالم انوار تجلی سے اس کو تفویض کیا جائے بحیثیت رازدار اس کو ان اسرار میں سے ذرا سا بھی ظاہر نہیں ہونے دینا چاہیے جیسا کہ مثل مشہور ہے کہ کے راز کو جو ظاہر کر دے وہ پھر کسی لائق نہیں رہتا۔

○ خواجہ منصور ؒ کی ایک بہن تھیں جن کا طریقہ تھا کہ وہ بغداد کے صحرا میں چلی جاتیں اور وہاں عبادت الٰہی میں مشغول ہو جاتیں جب ان کی واپسی کا وقت ہوتا تو فرشتہ کو فرمان جاری ہوتا کہ شراب جنت کا ایک پیالہ جس میں اسرار الٰہی گھلے ہوئے ہوں ان کے ہاتھ پر رکھ دے۔ اس کو وہ پی لیتیں اور اپنے حجرے میں واپس آ جاتیں۔ یہاں تک کہ خواجہ منصور ؒ کو اس کا پتہ چل گیا۔ وہ موقع کی تاک میں رہے اور جب وہ ولیہ معمول کے مطابق باہر نکل کر روانہ ہوئیں تو پیچھے پیچھے خواجہ منصور ؒ بھی چلے وہ ولیہ اپنے متعینہ مقام پر پہنچ کر عبادت الٰہی میں مشغول ہوگئیں جب وہ عبارت سے فارغ ہوئیں تو حسب معمول فرشتہ نے بھرا پیالہ ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ پینے لگیں۔ ابھی تھوڑا ہی پیا تھا کہ خواجہ منصور ؒ فریاد کناں بڑھے اور آواز لگائی۔ "اور میرا حصہ بہن؟" ولیہ نے مڑ کر دیکھا تو خواجہ منصور کو دیکھ کر بہت متاسف ہوئیں اور کہا۔ "آفسوس میرا راز ظاہر ہوگیا۔" پھر منصور سے مخاطب ہو کر بولیں۔

اے منصور کیا تم یہ پیالہ پینا چاہتے ہو؟ لیکن تم غالباً اس کے متحمل نہ ہو سکو گے۔" غرض خواجہ منصور نے اس جام میں جو بچا ہوا تھا پی لیا لیکن اتنا سا پینے کے بعد ان کی حالت دگرگوں ہوگئی اور وہ اناالحق کا نعرہ لگاتے ہوئے نکل گئے۔ خواجہ منصورؒ کی بہن یہ حالت دیکھ کر رونے لگیں اور منصورؒ سے شکوہ کرتے ہوئے بولیں۔ "اے تنگ حوصلہ انسان! خود بھی رسوا ہوا اور مجھے بھی شرمسار کیا۔" اس کے بعد جب خواجہ منصورؒ نے اعلانیہ شہر میں آکر اناالحق کا نعرہ لگایا تو شریعت کے بموجب انہیں دار پر چڑھا دیا گیا۔ قتل سے پہلے خواجہ منصورؒ کی بہن ان کے سامنے گئیں اور بادیدۂ نم فرمایا۔ "میں نے نہیں کہا تھا منصور کہ تم اس جام کو پینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ تم نہ مانے (پی کر) دوست کے راز کو ظاہر کر دیا اور پھر تمہیں اس کی سزا میں اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔" منصورؒ کے قتل کے بعد عوام میں چرچے ہونے لگے کہ بے شک منصورؒ مرد تھا کہ اپنے دوست کی راہ میں جان دے دی۔ ان کی بہن یہ چرچے سن کر مسکرائیں اور فرمایا کہ "اے غافلو! اگر میرا بھائی منصور مرد ہوتا تو ایک ذرا سے شربت محبت کو پی کر از خود رفتہ نہ ہو جاتا۔ حقیقتاً وہ مرد نہیں تھا کیونکہ شربت محبت کو پی کر وہ بہک گیا اور پھر ان ولیہ نے اپنا واقعہ بیان کیا کہ آج کم و بیش بیس سال کے قریب ہوئے ہیں کہ ہر رات کو اسرار دوست کا ایک جام پی جانا میرا معمول ہے میں تو اسے پی کر کبھی نہیں بہکتی بلکہ **ھل من مزید** یعنی "کچھ اور" ہی کے الفاظ منہ سے نکلتے رہتے ہیں۔

○ "اے درویش! راہ خدا میں ایسے بہت سے مرد ہیں کہ اسرار دوست کے ہزاروں دریاؤں کو ایک گھڑی میں فرو کر جاتے ہیں اور ان پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ جو محبت میں سچا اور ثابت قدم نہیں ہے۔ یقین جانو کہ کل قیات کے دن عاشقوں کے درمیان شرمسار ہوگا۔

○ اے درویش! ایک جگہ قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے اپنی تواریخ میں لکھا

ہے کہ کل قیامت کے دن فرمان الٰہی ہو گا کہ مجنون کو حاضر کرو' جب اس کو حاضر کیا جائے گا تو حکم ہو گا کہ ان تمام اولیا کو جن کو میری محبت کا دعویٰ تھا مجنون کے مقابلہ میں پیش کرو۔ جب سب حاضر کیے جائیں گے تو خطاب ہو گا کہ اگر محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو اس طرح کرو جیسے مجنون نے کیا' جب تک زندہ رہا اس کی محبت میں سرشار رہا اور جب مرا تو اس کی محبت میں غرق مرا اور آج جب اسے بلایا گیا ہے تو اس وقت بھی اسی طرح غرق محبت ہے۔ عاشقوں کے لیے یہ کسوٹی ہے یعنی جو شخص کہ دوستی کا دم بھرتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ ثابت قدم رہے تاکہ ذرا سی بھی دوستی کم نہ ہو بلکہ روز بروز زیادہ ہی ہوتی جائے۔

اے درویش! منصور حلاج ایک سال تک بخار میں مبتلا رہے اور اس ایک سال میں کسی شخص نے بھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے اپنی عبادت اور وظیفہ میں ذرا سی بھی کمی کی ہو بلکہ اور زیادہ عبادت کرنے لگے۔

مولانا جلال الدین روم (م 1273ء) کا شمار فارسی کے مشہور ترین شعرا اور اکابرین اولیاء اسلام میں ہوتا ہے۔ مثنوی معنوی کے باعث چار دانگ عالم میں شرف قبولیت رکھنے والے تھے ان کا شمار بیک وقت فلسفیوں' صوفیوں اور متجددین امت میں ہوتا ہے۔ تبحر علمی کے ساتھ ساتھ آپ کو عرفان الٰہی میں بھی بہت بڑا حصہ ملا ہے۔ ان سے جاری تصوف کا سلسلہ مولویہ یا جلالیہ آج بھی قونیہ اور ترکی کے کئی دوسرے شہروں میں باقی ہے۔ ان کا دیوان' دیوان شمس تبریزی کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے مثنوی معنوی میں حسین بن منصور کو عارف کامل بتایا ہے۔ ان کے نزدیک طالب حقیقی کی اپنی ہستی فنا ہو جاتی ہے اور اس کے دل و دماغ اور قلب و جگر پر صرف مطلوب حقیقی ہی نقش ہو جاتا ہے۔ طالب حقیقی کا دل مطلوب حقیقی کے نور سے منور ہو جاتا ہے۔ انسان اور باری تعالیٰ لوہا اور آگ ہیں وصل صرف اوصاف کا وصل ہے۔ لوہا صرف آگ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

مولانا جلال الدین رومی اپنی مثنوی میں امام قشیری ؒ' شیخ فرید الدین عطار ؒ' شیخ عبدالوہاب شعرانی ؒ' شیخ ابن عربی ؒ' امام ابوبکر شبلی ؒ' شیخ ابوالقاسم نصر آبادی ؒ' ابوالعباس ابن عطا ؒ' امام بن خفیف ؒ' علامہ عبدالرؤف مصری ؒ اور دوسرے کئی بزرگان طریقت اور علماء و فقہاء کی طرح منصور حلاج کو عارف کامل اور ان کے نعرہ اناالحق کو جائز قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

چوں اناالحق گفت شیخ و پیش برد
پس گلوئی جملہ کوران را فشرد

آن انا بی وقت گفتن لعنت ست
واین انا در وقت گفتن رحمت ست

آن انا منصور رحمت شد یقین
وین انا فرعون لعنت شد بین

بود اناالحق در لب منصور نور
بود انا اللہ در لب فرعون زور

بلکہ وحدت گشت اورا در وصال
شد خطاب او خطاب ذوالجلال

بعد از آن گوید حقم منصور وار
تاشود برادر شہرت او سوار

آنک اوبی ورد باشد رہزن ست
ژ انک بی وردی اناالحق گفتنت

آن منم خم خود اناالحق گفتنت
رنگ آتش دار والا آ ہنت

رنگ آہن محو رنگ آتش است
نہ آتشی می لافد و خامش وش است

چوں بہ سرخی گشت ہمچو زر کان
پس انا النار ست لافش بی زبان

شد نہ رنگ و طبع آتش محتشم
گوید او من آتشم من آتشم

آتشم من گر ترا شک ست وطن
آزمون کن دست را درمن بزن

چوں قلم در دست غداری بود
بی گمان منصور برداری بود

چوں سفیہان راست ایں کار و کیا
لازم آمد یقتلون الانبیاء

آتشم من گر تراشد مشتبہ
رومی خود بر روئی من یک دم بہند

ما مست الستیم جیک جوعہ چو منصور
اندیشہ فتوائے سردار ندا ریم

مولانا کے نزدیک خدا کی توحید کو سمجھنا یا سیکھنا خدا کی وحدانیت میں اپنے آپ کو فنا کرنا ہے جو شخص خدا کی ذات میں اپنے آپ کو تانبے کی طرح کیمیا میں پگھلاتا ہے وہی دراصل خدا کی حقیقت کو بھی پالیتا ہے۔ جو شخص اپنی ذات کو خدا کی ذات میں فنا کر دیتا ہے وہ باقی رہتا ہے اور جو اپنی ذات کو اس کی ذات سے جدا رکھتا ہے وہ فنا ہو جاتا ہے۔ ابن منصور خدا کا عاشق اور اس کے نور میں فناہو کر اپنی ہستی مٹانے والا تھا۔ عالم وجد میں ناالحق کہنے کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ خدا بن گئے ہیں بلکہ مقصد اپنے آپ کو خدا کی ذات یں فنا کرنا تھا۔ فرعون نے اناالرب کا اعلان انسانیت کی تکمیل کے بغیر اور اپنے وجود کے ستقلال کے لیے کیا تھا جس کی بنا پر "انا" اس کے لیے لعنت ثابت ہوئی جبکہ منصور نے نس امارہ کو مغلوب کرنے اور مجاہدہ اور ریاضت کے بعد اناالحق کا نعرہ لگایا اس لیے یہ نعرہ عث رحمت ثابت ہوا۔ مولانا نے اپنی وفات کے بعد اپنے مریدوں سے کہا تھا کہ میرے رنے سے غمگین نہ ہونا کہ منصور کے نور نے ڈیڑھ سو بعد فرید الدین عطار کی روح پر تجلی ل تھی اور ان کا مرشد ہوا تھا۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں حلاج کے فلسفے سے متعلق دو دور ہیں۔ عجم (1908ء) ے لے کر زبور عجم (1927ء) جو محمود شبیری کے گلشن زار جس میں اناالحق کے بارہ میں وال تھا کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس دور میں علامہ نے حلاج کو شنکر اچاریہ سے ملا ر ذکر کیا اور قوم کو اس فلسفہ سے دور رہنے کی ہدایت کی۔ اس دور میں علامہ اناء الحق کو

ویدانتی نعرہ سے مربوط کرتے ہیں اور قوم سے کہتے ہیں کہ شنکر اور منصور حلاج کے حق میں خودی کو غرق اور فنا کرنے کے فلسفے سے باز رہنا چاہیے اور باری تعالیٰ کو اپنی خودی کے وسیلے ہی سے تلاش کرنا چاہیے۔ انہوں نے اناء الحق کو وحدت الوجود کا علمبردار قرار دیا۔ دوسرا دور 1928ء کے بعد شروع ہوتا ہے جس میں جاوید نامہ لکھا گیا۔ جاوید نامہ 1933ء میں شائع ہوا۔ حلاج کے متعلق ان کا نیا نظریہ جاوید نامہ اور خطبات میں ظاہر ہوتا ہے۔ غالباً اس دور میں وہ ماسینیون کی تحقیق سے متاثر ہوئے جس کا ذکر انہوں نے خطبات میں بھی کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حلاج باری تعالیٰ کی الوہیت سے باغی نہ تھا اور اس کے اناالحق کے روحانی تجربے کو وحدت الوجودی طور پر سمجھنا کہ "ایک قطرہ سمندر میں غرق ہوتا ہے" غلط ہے اس کے صحیح معنی یہ نہیں کہ خودی خدا میں وصل ہوئی جیسا کہ اناالحق کا عام فہم تصور ہے بلکہ خودی کی انفرادیت قائم رہی ایک اور ہمہ گیر شخصیت کے ساتھ جس میں وہ گم نہیں ہوتی۔ علامہ نے جدید الٰہیات اسلامیہ میں اناء الحق کو نئے معانی پہنائے ہیں۔ وہ اناء الحق کو تخلیقی صداقت قرار دیتے ہیں۔ ارمغان حجاز کے یہ اشعار اس نئے انداز نظر کے غماز ہیں۔

اناالحق جز مقام کبریا نیست
سزائے او چلیپا ہست یا نیست

اگر فردے بگوید سرزنش بہ
اگر قومے بگوید ناروا نیست

بہ آں ملت اناالحق سازگار است
کہ از خونش غم ہر شاخسار است

نہاں اندر جلال او جمالے

کہ اورا نہ سپہر آئینہ دار است

رندوں کو بھی معلوم ہیں صوفی کے کمالات
ہر چند کہ مشہور نہیں ان کے کرامات

خودگیر و خوداری و گلبانگ اناالحق
آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات

حلاج کے اس فلسفہ کو کہ میرے محبوب مجھے قتل کر دو کیونکہ مرے قربان ہونے میں میری زندگی ہے۔ کو ابن العربی اور رومی نے اپنایا اور جاوید نامہ میں جو غزل طاہرہ سناتی ہے میں یہی عقیدہ مضمر ہے۔

گرم تبو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ روبرو
شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بمو
در دل طاہرہ گشت و ندید جز ترا
صفحہ بہ صفحہ' لا بہ لا' پردہ بہ پردہ' تو بہ تو

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ حسین بن منصور کا دعویٰ اناء الحق اور افشائے راز کے جرم میں اس کا برسردار جان دینا شاعرانہ تصوف کا لطیف ترین نکتہ ہے سنائی اور سب سے زیادہ شیخ عطار' مولانا رومی اور حافظ وغیرہ صوفی شعراء کے اس بلند بانگ اشارہ کے آگے تاریخ کی واقع گو آواز بالکل دب کر رہ گئی ہے۔ ہمارے صوفیائے کرام تقریباً سات سو برس سے اس کو اپنی جماعت کا بہترین رکن سمجھتے ہیں۔ وحدۃ الوجود جس کا تخیل چھٹی صدی سے مسلمانوں میں آیا ہے' حسین منصور اس کا فصیح ترین شارح اور صحیح معتبر سمجھا جاتا ہے۔ ان کے محاورات میں اس کا جرم یہ نہیں ہے کہ اس نے اپنی خدائی کا دعویٰ کیا بلکہ اصلی جرم یہ ہے کہ وہ راز حقیقت جو مدت سے سینوں میں امانت چلا آیا تھا اس نے ہر کس و ناکس کے سامنے فاش کر دیا' اس نکتہ کو ہمارے حقیقت دان صوفی شعراء کس کس

مزے سے بیان کرتے ہیں اور کس لطف سے اس گرہ کو کھولتے ہیں حالانکہ سچ یہ ہے کہ محی الدین ابن عربی سے پہلے مسلمان طبقہ صوفیا اس رمز سے ناآشنائے محض تھا' حضرت جنید وغیرہ صوفیائے متقدمین کی طرف اس قسم کے جو چند اقوال منسوب کیے جاتے ہیں وہ تاریخی اسناد سے ثابت نہیں۔ لہٰذا تاریخیں اس امر پر متفق اللفظ ہیں کہ حلاج نیرنگ' شعبدہ بازی اور ہاتھوں کے کھیل میں بہت چالاک اور بہت مشاق تھا' روپے برسا دیتا تھا' طرح طرح کے میوے منگوا دیتا تھا' ہوا پر اڑتا تھا اور بھی کچھ عجائبات دیکھاتا تھا' ایک دفعہ ایک شخص نے کہا کہ تم کوئی ایسا سکہ دکھاؤ جس پر خلیفہ کے بجائے تمہارا نام کندہ ہو' لیکن یہ بازی گر دعویٰ الوہیت کے باوجود اپنے نام کا ایک سکہ بھی بنا کر نہ دکھا سکا' اس کے ہمسفر کا بیان ہے کہ یہ اس کے ساتھ صرف اس غرض سے ہندوستان آیا تھا کہ یہاں کی مشہور شعبدہ بازیوں کی تعلیم حاصل کرے' چنانچہ اس کے سامنے ایک عورت سے اس نے رسی پر چڑھ کر غائب ہوجانے کا شعبدہ سیکھا اسے راہ میں کڈھے کھود کر کہیں پانی' کہیں میوہ' کہیں کھانا پہلے چھپا دیا جاتا' پھر اپنے ہمراہیوں کو لے کر اس سمت میں سفر کرتا اور بوقت ضرورت اپنی کراماتوں کے تماشے دکھاتا وہ مسئلہ وحدۃ الوجود کی بنا پر قتل کیا گیا۔

مولانا ظفر علی خان حسین بن منصور کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ طریقت اگر منافی شریعت نہیں ہے تو ہم ان لوگوں کو دخیل فی الطریقت کہنے پر ازروئے اسلام مجبور ہیں جو "کوئے جاناں سے خاک لاتے ہیں" اور اپنا کعبہ الگ بناتے ہیں ایسے ہی افراد میں حسین بن منصور بھی تھے جنہیں عجمی تصوف کے شاعرانہ لٹریچر نے خدا بنا دیا ہے۔ انہیں زوال تمدن عرب کے زمانہ میں طریقت کا شیخ المشائخ مانا گیا۔ فتنہ تاتار نے ان کی ساری کتابیں ضائع کر دیں اور سارے نسخے ناپید ہوگئے تھے لیکن دانا پانی فرہنگ کے ذوق علمی نے اس کی ایک کتاب کو زمانہ میں روشناس کروا لیا ہے جس سے حلاج کے تصوف کا علم ہوا ہے۔ حیف ہے کہ حلاج کا یہی غیر اسلامی تصوف ہمارے آج کل صوفیوں میں رائج ہے اور وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ جس زندقہ کے وہ شیدائی ہیں وہ الحادی الدین تھے کفر باللہ تھے۔ استہزاد بالقران ہے۔ اصلی تصوف کو اس سے کچھ سروکار نہیں۔ طریقت

اس سے بے زار ہے اور حقیقت کو اس کے انتساب سے ہزار در ہزار ننگ و عار ہے۔

متشرقین میں پروفیسر براؤن اپنی تالیف "تاریخ ادبیات ایران" میں مولف الفہرست کی تحریر کا کامل حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ حسین بن منصور دراصل شیعوں کے آٹھویں امام علی الرضا کا مقرر کردہ داعی یا مبلغ تھا۔ چنانچہ کوہستان (ایران) میں اسے اسی حیثیت میں گرفتار کر کے درے لگائے گئے۔ میکس ہارٹن جس نے تصوف پر خاصی خامہ فرسائی کی ہے لکھتا ہے کہ حلاج برہمنوں جیسے عقائد رکھتا تھا۔ برطانوی محقق رینالڈ نکلسن (1868ء- 1945ء) جس نے اسلامی تمدن اور ادبیات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا پائے۔ زندگی بھر ان موضوعات پر تحقیق کرتے ہوئے حلاج کو موحد قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ حلاج کے نظریات کا گہرا اثر موجود ہے اور اناء الحق کے الفاظ اس کے بعد بھی زندہ رہے اور قرون وسطیٰ میں بار بار ابھرتے رہے۔ ماسینون جسے حلاج کے بارہ میں ایک اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے حلاج کو شہید قرار دیا ہے۔

الفریڈ ڈان کریمر لکھتا ہے کہ تصور باری تعالیٰ اور لاہوت و ناسوت محدود لامحدود جیسے تصورات عرب دنیا میں متعارف کرانے کا سہرا ایک ایسی شخصیت کے سر تھا جو ایک غریب پارچہ بان تھا اور جس کا عرف حلاج تھا اگرچہ اس کی سوانح حیات سنی اور شیعہ مورخین مختلف انداز میں پیش کرتے ہیں' تاہم ان میں اس امر پر کوئی اختلاف رائے نہیں کہ حلاج کے بے شمار پیروکار تھے جو اپنے مرشد کی بے حد عزت کرتے تھے اور اس کی ذات سے روحانی کرامات منسوب کرتے تھے لہٰذا راسخ الاعتقاد افراد نے اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے ڈر کر حکومت وقت پر زور دیا کہ اس کے خلاف مناسب اقدام کیے جائیں اور 921ء میں سخت تکالیف دینے کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا۔

خلیفہ المقتدر کے زمانہ میں حلاج کو مختلف الزامات کے تحت گرفتار کر کے آٹھ سال سات مہینے اور آٹھ دن تک مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔ ان پر جو اہم الزامات عائد کیے گئے یا کیے جاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ۔

ا۔ اس کا نعرہ اناء الحق و دید انتی نعرہ سے مربوط ہے۔

2- حلاج معتزلہ سے متاثر تھا۔

3- حلاج قرامطی تھا۔

4- حلاج حلولیت کا قائل تھا۔

5- حلاج فلسفہ وحدت الوجود کا بانی تھا۔

6- حلاج کا تصوف میں کوئی مقام نہیں ہے۔

آیئے حلاج کے نظریات کو پڑھنے سے پہلے ویدانت' عقائد متعزلہ و قرامط' تصوف' فلسفہ حلول و وحدت الوجود کے بنیادی نکات دیکھتے ہیں۔

ویدانت' تصوف' حلول اور وحدت الوجود

خدا کا تصور:

اپنشدوں میں تحریر ہے کہ برہمن ایک ہے اور ہر اعتبار سے ایک ہے۔ نہ کوئی اس کا مدمقابل ہے' نہ شریک ہے' نہ اس کی مثل ہے' نہ اس کا ہمسر ہے۔ صرف وہی ایک اکیلا برہمن' واجب الوجود ہے اور یہ کائنات ممکن الوجود ہے۔ خدا اور کائنات کی وضاحت کے سلسلے میں اپنشدوں خصوصاً "برہم سوتر" کے شارحین چار گروہ میں منقسم ہوئے۔

1- قائلین عقیدہ "ہمہ از اوست"

2- قائلین "ہمہ با اوست"

3- قائلین "ہمہ اوست"

4- قائلین "ہمہ اوست" (ممکنات کا وجود وہمی ہے)

نظریہ ہمہ از وست کے مطابق موجودات موجود بالعرض ہیں۔ موجودات میں وجود حقیقتاً پایا جاتا ہے اور تمام موجودات حق تعالیٰ سے منفصل ہیں۔ ممکنات حق تعالیٰ کے ساتھ قائم ہیں۔ بذات خود قائم نہیں ہیں جبکہ نظریہ ہمہ اوست کے مطابق صرف حق تعالیٰ ہی حقیقی معنوں میں موجود ہے۔ ممکنات کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ ظلی ہے۔ ہر شے مظہر حق ہے۔ ہر شے سے وہی ظاہر ہو رہا ہے اور ہر شے میں اسی کا جلوہ ہے۔ نظریہ' ہمہ اوست (وجودی) کے مطابق صرف حق تعالیٰ ہی حقیقی معنوں میں موجود ہے۔ ممکنات کا وجود وہمی ہے۔

عیسائیت میں خدا کا تصور اس طرح ہے۔ خدا ایک ہے۔ وہ اولین محرک یا بے علت ہے۔ خدا نے عدم میں سے دنیا تخلق کی۔ خدا نے اپنے ارادے سے دنیا بنائی۔ دنیا کی تخلیق زمان و مکاں میں' بلکہ خدا نے زمان و مکاں کی تخلیق دنیا کے ایک حصے کے طور پر

کی۔ تخلیق شدہ دنیا اچھی ہے۔ خدا اچھا، شفیق اور عادل ہے۔ خدا اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے۔ خدا مہربان ہے خدا اگرچہ مطلق اچھائی اور مطلق علم ہے لیکن انسان کو غلط راہ پر چلنے اور نتائج کا دکھ سہنے سے بچانے کا اختیار نہیں رکھتا۔ عیسیٰؑ بھی باپ یعنی خدا کے برابر ہیں۔ خدا بطور باپ ارض و سماء کا خالق ہے، خدا بطور بیٹا انسانیت کا نجات دہندہ ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰؑ خدا کی تجسیم تھے، وہ الوہی محبت، الوہی رحمت اور الوہی نیکی کی کامل تجسیم تھے۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ خدا نہیں۔

یہودیت کی رو سے خدا تمام قوت کا سرچشمہ اور جوہر ہے۔ وہ کائنات کا خالق اور حکمران ہے۔ تمام ہست اس کا تخلیق کردہ ہے اور وقوع پذیر ہونے والا سب کچھ اس کا کارنامہ۔ اس کی قوتیں اس کے ارادے سے ہی محدود ہیں۔ "وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" خدا قادر مطلق اور عالم کل ہے۔ وہ ہمہ سماعت، ہمہ بصارت اور علیم و کبیر ہے۔ وہ ابدی اور زمان و مکان سے ماورا ہے۔ انسان خدا کے ساتھ خصوصی تعلق کا حامل ہے۔ انسان کو خدا نے اپنی شکل جیسا بنایا؟ انسان کو خدا کی طرف سے دی ہوئی روح کا حامل سمجھ کر تعظیم دی گئی۔ یہ امر انسان اور خدا میں ایک شخصی تعلق قائم کرتا ہے۔ خدا نے انسان کو ذہنی اور روحانی خصوصیات ودیعت کی ہیں اور اسے خدا کے مقاصد کی تکمیل میں حصہ لینے کا کہا گیا، جسمانی اور روحانی دونوں اعتبار سے۔ خدا نے دنیا اور تمام موجودات کو بنایا لیکن اس نے اس کی ترقی کی ذمہ داری انسان کو سونپی۔ انسان کو زندگی کے مادی اور روحانی پہلوؤں کو ترقی دینے کی ذمہ داری بھی دی گئی۔ انسان پر زور دیا گیا کہ وہ پاکیزگی تک پہنچانے والی تمام مثبت نیکیاں سرانجام دے۔ یہودیوں کے مطابق خدا جیسا بننے کی جدوجہد کرنا اصل مقصد ہے۔ خدا اچھا، راستباز، منصف اور رحیم ہے۔ لہٰذا انسان میں بھی یہ وصف موجود ہونے چاہئیں۔

فلسفہ ویدانت

شنکر کا فلسفہ "ادویت ویدانت" کہلاتا ہے۔ جس کے بنیادی اصول اس طرح ہیں۔

1- صرف ایک حقیقت علیا ہے جس کا نام برہمن ہے جس سے یہ کائنات صادر ہوئی ہے۔ یہ حقیقت واجب الوجود ہے اور صرف یہی ہستی "ستیہ" الحق ہے۔ غیر مخلوق، غیر مولود اور غیر معمولی ہے۔ ازلی ہے ابدی ہے محیط کل ہے کوئی شے ایسی نہیں جس کی بنیاد برہمن نہ ہو۔ برہمن سے جدا ہو کر ہر شے معدوم کا مصداق ہو جاتی ہے۔ کوئی شے مستقل بالذات نہیں ہے۔ ہر شے کی حقیقت، امیلۃ اور واقعیتہ اضافی اور عارضی ہے۔

2- برہمن کے علاوہ جو کچھ ہے وہ است ہے۔ غیر حق ہے۔ ہر شے موجود ہونے سے پہلے معدوم تھی اور کچھ عرصے کے بعد معدوم ہو جائے گی۔ اس لیے جو شے بین العدمین ہو اس کی ہستی محض اضافی اور اعتباری ہے۔ اسی لیے کائنات کو سنسار کہتے ہیں جس کے لغوی معنی ہیں حرکت اور تغیر۔ یعنی یہ کائنات ہر آن متغیر ہے اس لیے اس میں جو کچھ ہے اسے نہ ثبات ہے نہ قرار ہے نہ دوام ہے۔

3- برہمن، است (حق) ہے، چت (ادراک یا شعور) ہے، اور انند (سعادا) ہے۔

4- برہمن محیط کل ہے اور ہر شے کی اصل و بنیاد وہی ہے۔ ہر شے اسی کے سہارے سے قائم ہے۔

5- برہمن اس کائنات میں جاری و ساری بھی ہے اور اس کائنات سے جدا بھی۔

6- برہمن غیر محدود ہے اور ازلی و ابدی ہے۔

7- برہمن اگرچہ واحد ہے لیکن اس نے اپنی آزاد مرضی سے اپنے آپ کو کائنات کی کثرت میں ظاہر کیا ہے۔

8- انسان کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو سکھی بنائے یا دکھی۔ وہ اپنی تقدیر کا خود مجاز ہے۔

9- برہمن، بدی کا خالق نہیں ہے۔ جب انسان اپنے وجود کے اعلیٰ قوانین سے منحرف ہوتا ہے تو گناہ یا بدی کا ظہور ہوتا ہے۔

10- جب تک عرفان حاصل نہ ہو، یعنی جب تک یہ حقیقت انسان پر منکشف نہ ہو کہ میں جسے باہر تلاش کر رہا تھا وہ میرے اندر پوشیدہ ہے یا انائے مقید بلحاظ وجود، عین انائے مطلق ہے، اس وقت تک اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس کائنات کو فریب نظر قرار دے کر، اعمال حسنہ سے بے نیاز ہو جائے۔ جب تک دوئی کا احساس باقی ہے، سنسار (کائنات) کا خارجی وجود تسلیم کرنا لازمی ہے اور سماجی قانون، اخلاقی، معاشرتی رسوم اور دھرم کے ضابطوں کی پابندی بھی ضروری ہے۔

فلسفہ تصوف

تصوف خدا کے ملنے، دیارفت کرنے یا دیکھنے کی شدید آرزو اور روح انسان کو اپنی اصل سے واصل ہونے کے اشتیاق کا نام ہے یا یوں کہئے کہ تصوف نظری اور عملی اعتبار سے، حقائق آفاق سے اعراض کئے بغیر ذات کبریائی کی قربت، اس کی رضا اور اپنے نفس کا عرفان حاصل کرنا ہے۔

تصوف کے معانی میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کوئی اس کا ماخذ صوف (کمبل) بتاتا ہے کوئی صفہ (چبوترہ) اور کوئی صفا یا صف بتاتا ہے۔ ایک رائے کے مطابق اس کا ماخذ یونانی لفظ Theosophy کی تعریب ہے جس کے معنی حکمت الٰہی ہیں۔ بعض صوفہ کو اس کی اصل قرار دیتے ہیں جو دراصل اس قبیلے کا نام تھا جو کعبہ کا خادم تھا بعض صوفانہ اور بعض صوف بمعنی اون بتاتے ہیں۔

تصوف اپنے تمام تر حسن و جمال اور عمل و جہاد کے ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ ایک حلقہ میں یہ تاثر موجود ہے کہ یہ ہندو، عیسائی، ایرانی اور یونانی فلسفہ روحانیت کی پیداوار ہے اور لفظ تصوف عہد نبوی میں مروج نہیں تھا۔ بعض نے انسائیکلوپیڈیا آف

اسلام کے حوالہ سے لکھا ہے کہ صوفی کا لفظ سب سے پہلے آٹھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ایک شیعہ کیمیاگر جابر بن حیان (120ھ) جو اقانیم ثلاثہ، تناسخ ارواح کا قائل اور حضرت علی کو امام صامت مانتے ہوئے خود کو ساتواں امام قرار دیتا تھا کے نام سے شروع ہوا۔ بعض علماء نے ابوہاشم بن شارک کوفی کو جسے بعض مورخین سنی العقیدہ، بعض شیعہ، بعض حلول و اتحاد کا قائل اور بعض دہریہ کہتے ہیں تصوف کا بانی قرار دیتے ہیں لیکن سنی العقیدہ لوگ ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ شیخ ابونصر سراج لکھتے ہیں کہ لفظ صوفی حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے سے معروف ہے اور یہ لفظ ارباب فضل و اصلاح کے لیے بولا جاتا تھا۔ شیخ شہاب الدین سہروری کے مطابق اس لفظ کو دوسری صدی ہجری میں شہرت حاصل ہوئی اور صوفیائے کرام مسلمانوں کی وہ جماعت ہے جو اتباع رسول میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئی۔ حضرت داتا ہجویری لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام اور سلف صالحین کے زمانے میں یہ نام اگرچہ موجود نہ تھا لیکن اس کی حقیقت ہر شخص پر جلوہ گر تھی۔ ابوبکر سراج لکھتے ہیں کہ خلفائے اربعہ کے زمانے تک تصوف اتنی عادی چیز تھی کہ مجموعی طور پر پوری امت کے اندر نفوذ کر گئی تھی۔ اور حضرت علی کی وفات کے بعد مورخین نے جس چیز کو شیعیت قرار دیا ہے وہ تصوف کے سوا کوئی شے نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اسلام میں ظاہر اور باطن میں کوئی تفریق نہیں ہے روحانی زندگی دراصل باطنی زندگی کی بہتر اور زیادہ ترقی یافتہ صورت ہے۔ ترک دنیا، علائق سے گریز اور زندگی کی نعمتوں سے کنارہ کشی بدھ مت کے عقیدہ نروان کی ایک صوفیانہ شکل ہے جس کو نو فلاطونیت نے فنا فی الہیت کا رنگ دے کر انسان کو عقل و فکر اور تجربی ذہنیت کی طرف سے ہٹا کر وجدان اور کشف کی طرف متوجہ کر دیا جس کا مقصد صرف اور صرف اس آدمی کا ذاتی طور پر سکون حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں تصوف کا سرچشمہ غیر اسلامی تصورات و عقائد و افکار ہیں۔ تصوف، بنی نوع آدم کے لیے بمنزلہ، افیون ہے۔ تصوف، زندگی کے حقائق سے گریز کی تعلیم دیتا ہے۔ تصوف نے مسلمانوں کے قوائے عملی کو مردہ یا کم از کم ضعیف کر دیا۔ تصوف نے اباح مطلقہ کا دروازہ کھول دیا اور یہ کہ تصوف نے مشرکانہ عقائد کی اشاعت کی

ہے۔

پروفیسر نکلسن لکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ان بزرگوں کو جنہیں حقیقت شناسی کا ادعا تھا اور جنہوں نے تصوف کی آڑ میں ہر ان کہی بات کی ہے۔ ہمیشہ اس بنا پر روادارانہ سلوک کا مستحق خیال کیا ہے کہ ان حضرات کی ناگفتنی اقوال ان کے لیے معنی دعاوی اور مجذوبانہ خود فراموشی کے شاخسانے تھے اور ایسی حالت میں ان سے کوئی باز پرس نہ ہونی چاہیے۔

مولانا ظفر علی خان لکھتے ہیں کہ اگر خود فراموش صوفی کی حالت سکر ہی حقیقت کی آئینہ دار ہے تو پھر یہ کیا ماجرا ہے کہ بے خود ہو کر اس کی زبان پر "اناالحق" کا نعرہ مستانہ تو جاری ہو جاتا ہے لیکن **قل هو الله احد** کی آسمانی آواز ستر ہزار پردوں کی فضاؤں کے اندر بھی گونجنے نہیں پاتی۔ وہ ناچ ناچ کر اور تھرک تھرک کر اور بھاؤ بتا بتا کر یہ تو کہنے لگتا ہے کہ میں ہی خدا ہوں لیکن اس کے جھوٹے منہ سے آج تک اس عالم بے ہوشی میں جسے عین ہوش کہا جاتا ہے یہ فقرے نہ نکلے۔ **هو الله الذی لا اله الا هو الملک القدوس السلام المومن المهیمن العزیز الجبار المتکبر** شاید یہ کہا جائے گا کہ یہ باتیں قال والوں کے لیے ہیں۔ قرآن خوانی بادہ پیمائی سے بادہ نوشوں کو اس سے کیا سروکار؟ شریعت ہی کا قانون ہے جس کی پابندی اہل حق پر فرض ہے اور جناب باری نے اپنے بندوں کو صدق و حقیقت کے اس فرض بزرگ کے علاوہ اور کسی امر کے لیے مکلف نہیں بنایا۔ کائنات میں جس قدر سچائیاں ہیں سب اسی قانون شریعت کے اندر موجود ہیں۔ روح انسانی ارتقا کے انتہائی معارج طے کرنے کے بعد راحت ابدی و عیش جاودانی کی جس معراج پر فائز ہو سکتی ہے وہ اسی قانون کا صدقہ ہے اس کے علاوہ نہ کوئی اور قانون ہے نہ کوئی اور ضابطہ اس کے مقابلہ میں اگر کسی اور دستور، کسی اور آئین، کسی اور کلیہ، کسی اور جزئیہ کو پیش کیا جاسکے تو وہ دراصل اسی کا تابع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس قانون اعظم کو پوری شرح و بسط کے ساتھ کھول کھول کر بتا دیا ہے لیکن ہم اس شرح میں نہ تو کہیں یہ لکھا ہوا پاتے ہیں کہ روح انسانی آفرینش عالم سے موجود تھی یا ذات باری کے جوہر

میں اس کا خروج ہوا تھا۔ ہم کو یہ بات بھی کہیں نظر نہیں آتی کہ باری تعالی کی حیثیت "ذاتاً" و "صفاتاً" بہ لحاظ خالق ہونے کے مخلوقات سے کچھ جدا نہیں ہے بلکہ وہ ہر ایک چیز کی عین ہے اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں وہ اسی طرح ساری و طاری ہے جس طرح بو گلاب میں ہو۔ یا کیف شراب میں۔ اس دقیق نکتہ پر بھی ہماری کہیں نظر نہیں پڑی کہ روح انسانی اپنے مبدء اصل یعنی ذات باری تعالی سے جدا ہو کر 35 ہزار نورانی پردوں کو چاک کرتی ہوئی اور 35 ہزار ظلمائی حجابات کو چیرتی ہوئی اس دنیائے دوں میں آتی ہے اور جب تک یہاں رہتی ہے اس کی غایت انعایات بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتی کہ کسی طرح تنزلات کے چکر میں سے نکل جائے اور بطریق مسعود ان ستر ہزار پردوں کو اٹھا کر اس قطرہ کی طرح جو بالآخر سمندر میں جا ملتا ہے' پھر خدا کے نور میں جا کر جذب ہو جائے اور دنیا و عقبیٰ' حشر و نشر' جزا و سزا' جنت و دوزخ ان سب تصورات کو قرآن کریم کی لفاظی سمجھ کر اپنی جداگانہ ہستی کو مٹاتی ہوئی خدا کی ہستی میں شامل ہو جائے کہ دراصل وہ خود بھی خدا ہی کا ایک جزو تھی۔ جو تھوڑی دیر کے لیے اس سے جدا ہو گئی تھی۔ ہم کو رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے قانون میں کہیں یہ قول بھی دکھائی نہیں دیتا کہ روح انسانی کائنات کی روح اعظم یعنی ذات باری میں ضم اگر ہو سکتی ہے تو محض بواسطہ تواجد و تراقص کہ ناچتے ناچتے حال آگیا اور روح صاحبہ پکار اٹھیں کہ پالیا' پالیا۔ میں ہی خدا ہوں اور بی صاحبہ کی سہیلیاں جو اس رقص والہانہ کے قطارگیوں میں شریک تھیں پکار اٹھیں کہ صل وجل۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام باتیں جنہیں تصوف نے حقیقت کا عطیہ قرار دے کر شریعت کے علی الرغم اسلام کے سر منڈھنا چاہا ہے اسلام کو ان سے کچھ تعلق نہیں اور اسلام میں ان کا نشان تک نہیں پایا جاتا اور اسلام کو حق ہے کہ اگر یونانی اور ویدانتی فلسفے کے ان شطحیات کو اس سے منسوب کیا جائے تو وہ جوش میں آکر کہے کہ **سبحانک هذا بهتان عظیم**

اس کے برعکس مشائخ تصوف' تصوف کو روح اسلام' جان اسلام اور روح ایمانی سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ذات کبریا اور باطن کی جانب انسان کا رجحان اس کی خلقت اور فطرت کے عین مطابق ہے انسان کے شعور و ادراک کا مستقل تقاضا ہے کہ وہ مبدء حقیقی

کے قریب تر ہو جائے اور اپنی ذات کی گہرائیوں سے آشنا ہو اور تصوف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی بدولت خدا انسان کا محبوب بن جاتا ہے وہ عشق کو تصوف کا طریقہ کار قرار دیتے ہیں اور ان کے مطابق محبت خداوندی کے بدلے میں خدا کی صفات بندے میں منعکس ہو جاتی ہیں اور اسے دیدار خداوندی نصیب ہوتا ہے۔ وہ درج ذیل آیات قرآنی کو بطور سند پیش کرتے ہیں۔

ترجمہ:

○ تیری منزل مقصود تیرا رب ہے۔

○ تم اس کو اپنے اندر کیوں نہیں تلاش کرتے۔

○ ہم انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی قریب ہیں۔

○ جدھر دیکھو حق تعالیٰ کا حسن و جمال ہے۔

○ وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔

متذکرہ بالا آیات قرآنی کے علاوہ درج ذیل حدیث کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ صحیح بخاری کی روایت ہے:

○ "حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب میرا بندہ نوافل یعنی زاید عبادات کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے تو میں اس سے محبت کرتا ہوں اور جب اس سے محبت کرتا ہوں اس سے اتنا قریب ہو جاتا ہوں کہ میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے دیکھتا ہے۔ میں اس کے کان بن جاتا ہوں اور مجھ سے وہ سنتا ہے۔ میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں اور مجھ سے پکڑتا ہے اور میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے چلتا ہے۔"

اس مقام کو فنا فی صفات الہیہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے بعد کا مقام فنا فی الذات الہیہ ہے کچھ اور احادیث اس طرح ہیں۔

○ مومن کی باطنی بصیرت سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

○ اللہ کی صفات سے متصف ہو جاؤ۔

مشائخ تصوف کا کہنا ہے کہ رسول پاک ﷺ نے علوم حقیقت کی شرح و بسیط کا کام حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد کیا تھا اور اس علم روحانیت جسے وہ تصوف کا نام دیتے ہیں کی اشاعت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے چار خلفا حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ، حضرت امام حسن بصریؒ اور حضرت کمیل بن زیادؓ کے ذریعہ فرمائی اور وہ ان کے ذریعے پھیلنے والی روحانیت کو سلاسل طریقت کا نام دیتے ہیں۔ یہ سلاسل روحانیت عرب سے نکل کر ایران اور ترکستان پہنچا اور پھر تصوف کے نام سے دنیا میں پھیلا۔ کتب تصوف کے بارہ میں وہ کشف المحجوب مصنفہ حضرت سید علی ہجویریؒ، قوت القلوب مصنفہ ابوطالب مکی، کتاب تعرف مصنفہ حضرت شیخ اسماعیل ابوبکر قلا آبادی، کتاب اللمع مصنفہ حضرت ابونصر سراج، احیا العلوم مصنفہ امام غزالی، رسالہ قشیری مصنفہ حضرت ابوالقاسم گورمانی کے علاوہ خالص ایرانی نسل کے اولیاء جن میں حضرت فرید الدین عطارؒ، حضرت ابوسعید ابو الخیرؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ، شیخ سعدی شیرازیؒ اور مولانا جامیؒ کی تصنیفات کا حوالہ دیتے ہیں جن میں جابجا قرآن و حدیث کی تعلیمات دی گئی ہیں۔

مشائخ طریقت سلوک الی اللہ کے ذریعے اللہ تک رسائی حاصل کرنے کا دعویٰ رکھتے ہیں ان کے نزدیک شریعت کے دو حصے ہیں ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ شریعت کا ظاہری حصہ علم فقہ جبکہ باطنی حصہ کو علم تصوف کہا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک فقہ شریعت کا جسم اور طریقت یا تصوف اس کو روح ہے اور زیادہ فکر اور زیادہ عبادات و ریاضات کے ذریعہ انسان روحانی ترقی حاصل کرتا ہے۔ مشائخ طریقت روحانی مشق کرنے کے لیے الف، ب، ج پر مشتمل دائرہ استعمال کرتے ہیں جس میں نقطہ ب سالک کی روحانی ترقی کا آغاز ہوتا ہے اور وہ نقطہ ج کے ذریعے الف پر پہنچتا ہے۔ ب ج الف کے سفر کو سیر الی اللہ کا نام دیا گیا ہے اور مقام الف پر حق تعالیٰ کی ذات میں جو فنا حاصل ہوتی ہے اسے فنا فی اللہ کہا جاتا ہے۔ اور سالک قیامت کے بعد تک بھی فنا فی اللہ میں محو اور مستغرق رہ سکتا ہے۔ جب سالک نقطہ الف سے نقطہ ب پر آتا ہے تو اس سفر کو تصوف میں سیر من اللہ کہتے ہیں جس کے دوران اسے شان بقا باللہ حاصل ہوتی ہے۔ اس مقام کو بقا باللہ، عبدیت، عبودیت

اور غرق بعد الجمع اور جامعیت کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ فنائیت کے حصول کے بعد سالک حق تعالیٰ کی صفات سے متصف ہو جاتا ہے لہٰذا اسے خلافت الٰہیہ سے نوازا جاتا ہے۔ مقام الف کا خاصہ محویت، مغلوب الحال، ابن الحال، سکرومستی اور غرق اور وصل محبوب ہے جبکہ مقام ب کا خاصہ صحو، انسان الکامل، غالب الحال، ابوالحال اور فرض شناسی ہے مقام ب پر پہنچ کر اولیاء کرام بیک وقت واصل بھی ہوتے ہیں اور مہجور بھی اور مقام الف پر وحدت الوجود کا انکشاف ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں نعرہ اناالحق اسی مقام پر حالت سکر میں لگایا گیا تھا اور اس کے وہ معنی قطعاً نہیں ہیں جو سمجھے گئے ہیں۔ دراصل فنافی اللہ، بقا باللہ، وحدت الوجود، وحدت الشہود ایسے ادق اور اعمق مسائل ہیں جن کے لیے سال ہا سال کے مجاہدات و ریاضات اور تجرید و تعزید ضروری ہے۔ اگرچہ تمام صوفیائے کرام تصور شیخ، محبت رسول ﷺ اور مقصود حیات خدا کے تین کٹھن مراحل سے گزرتے ہیں لیکن ان میں معدودے چند کا مقصود حیات خدا ہوتا ہے اسی لیے واقعہ معراج بیان کرکے عبدالقدوس گنگوہی لکھتے ہیں: "وہ نبی تھے اس لیے خدا سے ملاقات کرکے واپس آ گئے میں جاتا تو کبھی واپس نہ آتا کبھی واپس نہ آتا۔"

کشف المحجوب میں داتا ہجویری رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں کہ تصوف خاصہ تکلف ہے اور یہی تصوف کے اصلی معنی ہیں۔ صوفی کو صوفی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اخلاق و معاملات مہذب کرلیتا ہے اور طبیعت کی آفتوں سے پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ حقیقی صوفی وہی ہوتا ہے جس کا دل کدورت سے پاک ہو جاتا ہے۔ اہل تصوف کی تین قسمیں ہیں صوفی متصوف اور مستصوف۔ صوفی صاحب وصول، متصوف صاحب اصول اور مستصوف صاحب فضول ہوتا ہے۔

حسن نوریؒ کہتے ہیں کہ تصوف تمام خطوط نفسانی کو ترک کرنے کا نام ہے اور صوفی وہ ہے جو غیر اللہ سے بری ہو کر صف اول اور درجہ اولیٰ سے پہنچتا ہے۔ حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ تصوف دل اور بھید کی صفائی اور کدورت کی مخالفت کا نام ہے۔ شبلیؒ کہتے ہیں صوفی وہ ہے جو خدائے عزوجل کے یہاں کوئی چیز نہ دیکھے۔ حضرت جنیدؒ لکھتے ہیں

تصوف کی بنیاد آٹھ خصلتوں پر ہے جس سے آٹھ پیغمبروں کی پیروی ہوتی ہے۔ سخاوت حضرت ابراہیم کی ہو، رضا حضرت اسماعیل کی ہو، صبر حضرت یعقوب کا ہو، اشارات حضرت زکریا کے ہوں، غربت حضرت یحییٰ کی ہو، سیاحت حضرت عیسیٰ کی ہو، لباس حضرت موسیٰ کی ہو اور فقر حضرت محمد ﷺ کا ہو۔

داتا ہجویری لکھتے ہیں کہ خلق کی ملامت خدا کے دوستوں کی غذا ہوتی ہے۔ ملامت عاشقوں کے لیے ایک تروتازہ باغ، دوستوں کے لیے مایہ ناز تفریح، مشتاقوں کے لیے راحت اور مریدوں کے لیے سرور ہے۔ اصحاب رضا میں جو خداوند تعالیٰ کی عطا پر راضی ہوتے ہیں وہ معرفت کے درجہ ہوتے ہیں۔ جو نعمتوں پر راضی ہوتے ہیں دنیا والے کہلاتے ہیں جو مصیبت پر راضی رہتے ہیں وہ رنج کے درجہ پر فائز ہوتے ہیں اور جو احوال و مقامات کی قید سے نکل کر صرف اللہ تعالیٰ کی رضا خوش پر رہتے ہیں محبت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوتے ہیں۔

ابو طاہر حرمیؒ کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنے اعتقاد کے مطابق جو چاہتا ہے مجھ کو کہتا ہے مگر یہ سب اسم نہیں ہیں القاب ہیں کوئی مجھ کو زندیق کہے تو اس میں جھگڑا کیوں کیا جائے۔ ابو یزیدؒ نے رمضان کے مہینہ میں آستین سے ٹکیہ نکال کر کھائی تو لوگ برگشتہ ہوگئے حالانکہ انہوں نے ایسا دانستہ کیا تھا۔ سکر حق تعالیٰ کی محبت کا غلبہ ہے اور اس وقت محویت اور فضا کی کیفیت طاری ہوتی ہے جبکہ صحو محویت کے بعد حصول مراد کا نام ہے۔ صحو غفلت کے قریب ہو تو سکر ہے اور سکر محبت کے قریب ہو تو صحو ہے اور جب دونوں کی اصل صحیح ہو تو سکر صحو اور صحو سکر ہے اور ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں۔

فلسفہ حلول اور وحدت الوجود

اس وقت دنیا میں درجہ ذیل تصورات وجود باری تعالیٰ موجود ہیں۔

نظریہ تنزیہ (TRAN SCENDANCE) "ذات باری تعالیٰ ماورائے عقل و فہم اور کائنات سے بالاتر ہے۔"

غیر مسلم حکما کا خیال ہے کہ ذات باری تعالیٰ اس کائنات سے علیحدہ اور بالا تر ہے اور انسانی عقل و ادراک سے ماورا ہے۔

نظریہ تشبیہ (IMMANENCE) "ذات حق اس کائنات کے اندر روح اور جان کی طرح جاری و ساری ہے۔ جیسے انسانی روح انسانی جسم کے اندر جاری و ساری ہے۔"

نظریہ ہمہ اوست یا پین تھی ازم (PATHEISM) "کائنات میں موجودات یا اشیاء کا وجود ذات باری تعالیٰ کا وجود ہے۔ وجود حق کے سوا کسی اور چیز کا وجود نہیں ہے اور ہر چیز میں خدا ہے غیر کوئی نہیں ہے۔

عیسائی اور ہندو ارباب روحانیت کا یہی عقیدہ ہے اس لیے بت پرستی' گاؤ پرستی' سورج پرستی اور انسان پرستی کو جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک رام' کرشن اور حضرت عیسیٰ خدا کے اوتار ہیں اور قابل پرستش ہیں۔

نظریہ وحدت (MONISM) "خدا ایک ہے اور کائنات کا وجود خدا تعالیٰ کے وجود میں شامل ہے۔"

نظریہ وحدت الوجود "اللہ واحدہ لاشریک ہے۔ نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے اور نہ اس کی صفات میں۔ وہ لامحدود ہے اور جہت و سمت سے پاک ہے۔ نہ اس کا کوئی جسم ہے اور نہ کوئی اعضا ہیں وہ ہر جگہ موجود ہے لیکن نہ کسی ایک جگہ میں سما سکتا ہے اور نہ کسی ایک چیز یا شخص میں سما سکتا ہے۔ یہ نظریہ توحید و تشبیہ اور تنزیہ دونوں پر مشتمل ہے اور اس نظریہ کو وحدت الوجود کہا جاتا ہے۔

نظریہ وحدت الوجود کی مخالفت کرنے والے قرآن پاک کی وہ تمام آیات پیش کرتے ہیں جن میں حق تعالیٰ کو خالق' معبود اور مسجود جبکہ بندہ کو مخلوق' عابد اور ساجد قرار دیا جاتا ہے۔ ان آیات قرآنی کے علاوہ پاک و پلید' حلال و حرام' سزا و جزا بیان کرنے والی آیات کو بھی بطور سند پیش کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر وحدت الوجود حق ہے تو یہ تمام باتیں بے معنی ہیں۔ نظریہ وحدت الوجود کو ماننے والے اس نظریہ کو قرآن پاک کی

درج ذیل آیات سے ثابت کرتے ہیں:

ترجمہ:

1- اللہ تعالیٰ ہر چیز پر محیط ہے۔
2- وہ (خدا تعالیٰ) تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔
3- ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔
4- تم جس طرف منہ کرو ذات حق ہے۔
5- سب چیز فانی ہے سوائے ذات حق کے۔
6- وہی اول ہے وہی آخر ہے وہی ظاہر وہی باطن ہے۔
7- اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔

ابن تیمیہ نے وحدت الوجود کو تسلیم کرنے سے اس وجہ سے انکار کیا کہ اس سے حلول و اتحاد لازم آتا ہے جو شریعت اسلامیہ کے خلاف ہے۔ حلول سے مراد وہی عقیدہ اوتار ہے جس کی رو سے ہندو اور عیسائی یہ سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ رام اور کرشن اور عیسیٰ کے وجود میں اتر آیا۔ عرف عام میں اس عقیدہ کو تجسیم (Reincaranation) یا حشویہ (Enthro Pomorphism) کہا جاتا ہے۔ حلول کے لغوی معنی شیر و شکر ہوتا ہے۔ اور نصاریٰ بالعموم حلول کے قائل ہیں۔ اتحاد کا مطلب خدا اور بندے کا متحد فی الذات ہو جانا ہے۔ جسے Fusion کہا جاتا ہے۔ حلول میں خدا اور انسان مل کر ایک شے ہو جاتے ہیں جبکہ اتحاد میں دونوں اپنی اپنی حالت ذاتی پر برقرار رہتے ہیں۔ اسلام میں حلول اور اتحاد دونوں کفر ہیں جبکہ اسلام میں وحدت الوجود کے ماننے والوں کا عقیدہ ہے کہ وجود اصل ایک ہے اور وہ ہے حق تعالیٰ کا وجود جبکہ حلول و اتحاد کے لیے دو وجود کا ہونا لازمی ہے۔

داتا ہجویریؒ کے مطابق فرقہ حلولیہ ابو حلمان دمشقی کی طرف منسوب ہے اور انہوں نے اسی فرقہ کو زندیق اور کافر کہا ہے۔ ان کے مطابق خدائے تعالیٰ میں بندہ کی روح کا حلول کرنا محال ہے کیونکہ روح حادث ہے قدیم نہیں۔ اس کو خدا کی صفت بھی کہہ سکتے ہیں۔ خالق اور مخلوق کی صفت یکساں نہیں ہوسکتی پھر قدیم و حادث اور خالق و مخلوق کی

صفت کیوں کر ایک دوسرے میں حلول کر سکتی ہے۔ روح محض ایک جسم لطیف ہے جو
خدا کے حکم سے قائم ہے اور اسی کے حکم سے آتی جاتی ہے اس لیے حلولیہ کا مسلک توحید
اور دین کے خلاف ہے جو کسی طرح تصوف نہیں کہا جاسکتا۔

الفریڈوان کریمر لکھتا ہے کہ "اسلامی زہد بتدریج وحدۃ الوجودی مذہبی جذبہ میں
تبدیل ہوا جو بعد میں آنے والے تصوف اسلامی کا اصل ثابت ہوا۔ بعد ازاں تصور باری
تعالیٰ اور لاہوت و ناسوت' محدود و لامحدود کا باہمی تعلق وغیرہ جیسے مضامین زیر بحث آتے
رہے۔ ان تصورات کو جو کہ اس وقت تک عربی تصوف میں نامعلوم تھے کیونکہ ان کا تعلق
تمدن کے ایک جداگانہ دائرہ عمل سے تھا۔ عرب دنیا میں متعارف کرانے کا سہرا ایک ایسی
شخصیت کے سر تھا جو ایک غریب پارچہ باف تھا اور جس کا عرف حلاج تھا۔ علامہ اقبال نے
بھی فلسفہ عجم میں منصور حلاج کو ان کے فلسفہ اناالحق کی وجہ سے وحدت الوجود کا بانی کہا
ہے جسے ابن عربی نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

نکلسن لکھتا ہے کہ اگرچہ ایران میں بادشاہوں کو الوہیت کا درجہ دیا جاتا تھا اور
ایرانیوں میں تجسیم' حلول' تشبیہ' تناسخ ارواح کے عقائد بھی مروج تھے اور ان کی نگاہ میں
کسی انسان کو الوہیت کا درجہ دے دینا چنداں قابل اعتراض نہ تھا مگر ایسا تصوف جو اسلامی
ہونے کا مدعی ہو؟ حلاج کی تعلیم کو قبول نہیں کر سکتا۔ یہ کہنا کہ ذات ایزدی اور ذات انسانی
دونوں آپس میں شیر و شکر ہو گئے ہیں عقیدہ توحید باری کی نفی کرنا ہے۔ حلاج دیگر مسلمان
صوفیا کی طرح وحدت الوجودی نہیں تھا بلکہ وہ روایت اور حلول ہر دو کا قائل تھا اور یہ اس
کی شخصیت کی خصوصیت ہے کہ اگرچہ اناالحق مندرجہ بالا دونوں پہلوؤں کو یکجا سموتا ہے
تاہم اس کے نزدیک ماورائیت کی بہترین مثال ابلیس ہے اور حلول کی بہترین مثال یسوع
مسیح۔ حلاج کی اپنی شخصیت میں دونوں ضدیں یکجا اور ہم آہنگ ہیں۔ پس وحدت
الوجودیت نہیں بلکہ Panentheism ہے۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ حلاج مسئلہ وحدت الوجود کا نہیں بلکہ مسئلہ حلول
قائل تھا۔ وحدۃ الوجود اور مسئلہ حلول میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ وحدۃ الوجود ک

ف تاویلیں اور تشریحیں لوگوں نے کیں' تاہم ان سب کا مشترک مقصود یہ ہے کہ تمام
ہیں حقیقی وجود صرف ایک ہی ہے' باقی یہ تمام جزئی اور متشخص ہستیاں اس کی پرتو ہیں'
چراغ اصل ہے اور جو روشنی اس سے پھیلتی ہے وہ اسی کا ظہور ہے یا انسان اصل ہے
اس کا یہ معدوم جو بظاہر موجود ہے' انسان کا عکس محض ہے یا اطلاق و تقلید کی تشریح
ہے کہ خدا وجہ و مطلق اور دنیا کی ہستیاں صرف اس کی تشخصیات اور تعنیات ہیں۔ مثلاً
یا اور موج' دھاگہ اور گرہ' تصویر اور کاغذ' موج دریا کی ایک خاص شکل' گرہ' دھاگے کی
خاص ہیئت اور تصویر کاغذ کی ایک خاص حد بندی کا نام ہے۔ اگر اس مخصوص شکل'
ن اور حد بندی سے قطع نظر کر لیا جائے تو موج' گرہ اور تصویر کا کوئی مستقل وجود نہیں
۔ حلول ایک مستقل مذہب ہے اور اس عہد کے بانیان فرق میں اس کی ایک خاص
خ ہے۔ حلاج سے پہلے ابو مسلم خراسانی' اور بابک خرمی وغیرہ اسی قسم کے دعوے کر
تھے۔ اس مسئلہ کا اصل موجد ابن سبا تھا۔ مسئلہ حلول درحقیقت ایک آرین تخیل
۔ جس کا دوسرا نام اوتار ہے یعنی کبھی کبھی جب دنیا مشکلات میں گرفتار ہو جاتی ہے تو
کسی انسان کی صورت میں جنم لیتا ہے اور اس کو ان سے نجات دلاتا ہے' حلاج اسی
یدہ کا داعی تھا اور چونکہ اس کا ہندوستان آنا مذکور ہے اس لیے عجب نہیں کہ یہیں اس
اس کی تلقین حاصل کی ہو۔

سینٹ آگسٹائن لکھتا ہے کہ "انسان حقیقت میں خود وہی ہے جو اس کا محبوب
ہے۔"

ایکھارٹ کا کہنا ہے کہ "اگر انسان پتھر سے لو لگائے' تو پتھر ہو جائے گا' انسان سے
لو کرے گا تو انسان ہو جائے گا' خدا کی محبت کے نشہ میں سرشار ہو گا تو...... لیکن مجھے
نہیں کہ اس سے آگے کچھ کہوں اس لیے کہ اگر ایک کلمہ بھی میرے منہ سے نکلا'
نے حقیقت کو ظاہر کر دیا اور میں نے کہہ دیا کہ انسان خدا کے عشق کے نشے میں چور
خدا ہو جائے گا تو آپ لوگ مجھے سنگسار کر دیں گے۔"

پروفیسر ماسینون نے "کتاب الطواسین" کے مقدمے میں لکھا ہے کہ "ابن عربی نے

حلول کی تعلیم نہیں دی بلکہ وحدت وجود کی تعلیم دی ہے جو حلول سے قطعاً" مختلف کیونکہ ان کی رائے میں قدیم اور حادث' الواحد کی دو شنون متممہ ہیں۔ (ایسی مثالیں جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں) اور باہمہ دگر لازمی ہیں۔ مخلوقات خالق کے خا مظاہر ہیں اور انسان وہ سرایزدی ہے جو بواسطہ مخلوق ظاہر ہوتا ہے لیکن انسان چونکہ م ذہن رکھتا ہے اور جملہ معروضات فکر کا ایک وقت ادراک نہیں کرسکتا اس لیے وہ وقت سرایزدی کے صرف کسی ایک جزو کا اظہار کرسکتا ہے۔ لہٰذا وہ کبھی "اناالحق" کہہ سکتا۔ وہ یکے از حقائق (ایک حقیقت) تو ہے مگر الحق (کل حقیقت) نہیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دوسرے صوفیوں نے مثلاً رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحریروں اس نازک فرق کو جو حلول اور وحدۃ الوجود کے درمیان متحقق ہے' نظرانداز کردیا۔ صوفیوں نے حلول اور اتحاد دونوں عقیدوں کی تردید کی ہے۔ اسلامی تصوف کی رو سے کسی انسان میں حلول کرسکتا ہے نہ کسی انسان سے متحد ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ابونصر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف "کتاب اللمع" میں ان دونوں عقیدوں کو رد کیا ہے۔ ماسینیو ثابت کرتا ہے کہ حلاج کے دینی عقائد میں خدا کی ماورائیت کارفرما ہے مگر ساتھ ہی ہے کہ خدا اپنے فضل سے مومن کے دل میں بھی جاگزیں ہوتا ہے۔ جبکہ وہ تزکیہ سے مصفیٰ و منزہ ہو جائے۔ انسان کو اس لیے خلق کیا گیا ہے کہ عشق الٰہی دنیا میں ظ وہ خدا ہی کی تمثیل ہے جس نے اسے ازل سے مشتاقانہ دیکھتے دیکھتے اس طرح الٰہی سے متصف کردیا کہ وہ ہو بہو یعنی وہی بن جائے۔ حلاج کہتا ہے کہ "وحدت حق کی خودی کو محو نہیں کردیتی بلکہ اسے اور بھی زیادہ کامل' مقدس اور الوہی بنا کر ایک زندہ عضو بنا دیتی ہے۔" ماسینوں نے اسے "خلق شوق" قرار دیا ہے۔

بغداد کے دور کے صوفیا میں یونانی کتب کے تراجم کے بعد سوالوں کی ا فہرست ظاہر ہوئی۔ الکلا بازی نے اپنی تصنیف کتاب التعرف میں ان سوالوں کی صورتیں گنوائی ہیں اور اشارہ کیا ہے کہ منصور حلاج نے ان صورتوں کو یکسر رد کیا سوالات کی ایسی صورتیں خدا کو مخلوق کے دائرے میں شامل کردیتی ہیں۔

الکلا بازی حلاج کا نظریہ ذات اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"صوفیہ اس بات پر بھی متفق ہیں کہ نہ آنکھیں اس کا ادراک کرسکتی ہیں اور نہ ظنون (خیالات) اس پر ہجوم لاسکتے ہیں اور نہ اس کی صفات متغیر ہوسکتی ہیں اور نہ اس کے اسماء متبدل ہوسکتے ہیں۔ وہ ازل سے اسی طرح ہے۔ جیسا کہ اب ہے اور اس میں کبھی تغیر واہ نہیں پاسکے گا۔ وہ الاول ہے' الاخر ہے' الظاہر ہے' الباطن ہے' بکل شئی علیم ہے۔ (ہر شی کا علم رکھتا ہے) اس کی مثل کوئی شے نہیں ہے اور وہ سمیع اور بصیر ہے۔"

روایت ہے کہ ابوبکر شبلیؒ نے ذوالنون مصریؒ کی مریدہ خاص فاطمہ نیشاپوری کو حسین بن منصور کے پاس اس وقت بھیجا جب وہ تختہ دار پر تھے اور ان کا ایک ہاتھ کاٹا جاچکا تھا۔ پوچھا تصوف کیا ہے۔ حسین بن منصور نے جواب دیا کہ جس حالت میں میں اس وقت ہوں تصوف ہے۔ پھر کہا کہ واللہ میں نے نعمت اور بلا میں کسی وقت بھی فرق نہیں کیا اور یہ بھی تصوف ہے۔ ایک اور روایت ہے کہ تختہ دار پر لوگوں نے پوچھا کہ عشق کیا ہے۔ جواب دیا تم اسے آج' کل اور پرسوں دیکھو گے کہ ایک دن ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے' دوسرے دن مار دیا جائے گا اور تیسرے دن ہوا میں خاک اڑادی جائے گی۔

عقائد قرامطہ

حضرت امامؑ جعفر صادق کی وفات کے بعد شیعہ تین گروہ میں تقسیم ہوئے۔ ایک گروہ نے امام موسیٰ کاظم کی امامت کو تسلیم کیا اور فرقہ امامیہ کہلایا۔ دوسرے نے حضرت اسماعیل کے بیٹے محمد کو امام مانا جبکہ تیسرے گروہ نے حضرت اسماعیل کو زندہ تسلیم کیا اور یہ دونوں فرقے اسماعیلیہ یا بابکیہ کہلائے۔ پھر یہ فرقہ میمونیہ' خلیفہ' قرامطہ' شمیطیہ' برقعیہ' جنابیہ اور مہدویہ میں منقسم ہوا ماسوائے مہدویہ کے باقی پانچ فرقوں کا شمار قرامطہ میں ہوتا ہے اور ان تمام فرقوں کو باطنیہ بھی کہا جاتا ہے۔ قرمطیہ جس شخص کی طرف منسوب ہے

اس کا نام ہمدان بن قرمط ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قرمط واسطہ کے علاقے میں ایک جگہ کا نام ہے نسیم الریاض کے مطابق احمد بن قرمط کی آنکھیں اور چہرہ نہایت سرخ تھا جس کی وجہ سے پہلے کرمینہ مشہور ہوا اور بعد از تحیف و تحریف قرمط ہوگیا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ لفظ عربی الاصل ہے اور قرمط البعیر سے نکلا ہے ۔بعضوں کا خیال ہے کہ قرامط کا ایک رئیس اپنے خط کو قرامطہ یعنی باریک لکھا کرتا تھا اس لیے اس گروہ کا نام قرامطہ پڑ گیا۔

ان کا عقیدہ ہے کہ ہر ظاہر کا باطن ہے اور وہ باطن اس ظاہر کا مصدر ہے اور وہ ظاہر اس باطن کا مظہر ہے اور کوئی ظاہر نہیں جس کا باطن نہ ہو ورنہ وہ فی الحقیقت کچھ بھی نہیں اور کوئی باطن نہیں جس کا ظاہر نہیں ورنہ وہ خیالی ہے اللہ نے عالم ظاہر و باطن پیدا کیے ہیں۔ عالم باطن عالم ارواح و نفوس و عقول ہیں اور عالم ظاہر عالم اجسام علوی و سفلی اعراض ہیں۔ امام باطن کا حاکم ہوتا ہے کسی کو بغیر اس کی تعلیم کے عالم بالا تک رسائی نہیں اور نبی عالم ظاہر اور شریعت کا حاکم ہوتا ہے جس کی طرف لوگ محتاج ہوتے ہیں اور یہ کام نبی کے سوا تمام نہیں ہوتا اور شریعت کا ایک ظاہر ہوتا ہے جسے تنزیل کہتے ہیں اور ایک باطن ہوتا ہے جسے تاویل بولتے ہیں اور زمانہ نبی یا شریعت سے خالی نہیں ہوتا اسی طرح امام سے یا اس کی دعوت سے خالی نہیں ہوتا اور دعوت کبھی مخفی ہوتی ہے اگرچہ امام ظاہر ہو اور کبھی دعوت ظاہر ہوتی ہے اگرچہ امام مخفی ہو جس طرح نبی کو معجزہ قولی و فعلی سے جانتے ہیں اسی طرح امام کو دعوت اور دعوے سے جانتے ہیں اور اللہ کو بغیر امام کے نہیں پہچان سکتے اور امام کا ہر زمانے میں موجود ہونا ضروری ہے ظاہر ہو یا مستور جس طرح کوئی وقت روشنی روز یا تاریکی شب سے خالی نہیں ہوتی۔ صفات میں سے کسی صفت کے ساتھ خدا اور مخلوق کا مشترک جاننا اشتباہ کا موجب ہے اس لیے باری تعالیٰ کو صفت وجود کے ساتھ بھی موصوف نہ کرنا چاہیے۔ یعنی موجود نہ ماننا چاہیے بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ وہ معدوم نہیں ہے اور نہ اس کو عالم اور قادر اور حی کہنا چاہیے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ عاجز نہیں جاہل نہیں میت نہیں۔

ذہبی کے مطابق قرمط لوگوں کو اس بات کی دعوت کرتا تھا کہ اہل بیت میں امام منتظر

یعنی مہدی موجود ہیں تم ان کی اطاعت کرو عباس نے اس کی متابعت کرلی۔ ہیصم نے کہ کوفے کا حاکم تھا قرمط کو پکڑ کر قید کر دیا مگر کسی ترکیب سے قید خانے سے نکل گیا اور لوگوں پر ظاہر کیا کہ مجھے قید بند نہیں روک سکتی ہے اور کہتا تھا میں وہی ہوں جس کی بشارت احمد بن حنفیہ نے دی تھی اور ایک تحریر لایا تھا جس کی نقلیں قرامط نے بڑی عقیدت کے ساتھ لی تھیں جس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد یہ مضمون تھا کہتا ہے فرج بن عثمان اور وہ رہنے والا قریہ نصرانہ کا ہے کہ وہ داعی ہے شیخ کا اور وہ مسیح عیسیٰ ہے اور وہی عیسیٰ کلمہ ہے اور وہی مہدی ہے اور وہ مسیح احمد بن خنفیہ ہے اور وہی جبریل ہے اور تحقیق مسیح انسان کی صورت بن گیا اور کہا تحقیق تو ہی بلانے والا ہے تو ہی محبت ہے اور تو ہی ناقہ ہے اور تو ہی دابہ ہے اور تو ہی یحییٰ بن زکریا ہے اور تو ہی روح القدس ہے اور اس کو بتایا کہ نماز چار رکعت ہیں دو رکعت طلوع شمس کے قبل اور دو رکعت غروب آفتاب کے قبل اور اذان ہر نماز میں یوں دینا چاہیے۔ **الله اکبر الله اکبر الله اکبر الله اکبر اشهد ان لا اله الا الله اشهد ان لا اله الا الله اشهدان ادم رسول الله اشهدان نوحا رسول الله اشهدان ابراهیم رسول الله اشهدان عیسی رسول الله اشهدان محمد رسول الله اشهدان احمد بن محمدبن الحنفیته رسول الله** اور قبلہ بیت المقدس کی طرف اور جمعہ دو شنبے کا دن ہے اس دن کوئی کام نہ کرنا چاہیے اور ہر ایک رکعت میں استفتاح پڑھنا چاہیے جو احمد محمد بن حنفیہ پر نازل ہوئی ہے بعد اس کے رکوع میں جانا چاہیے۔ اور وہ صورت یہ ہے۔ **الحمد لله بکلمته و تعالی باسمه المنجد لا ولیائه با ولیائه قل ان الاهلته مواقیت للناس ظاهر هالیعلم عدد السنین والحساب و الشهود و الایام و باطنها لاولیائی الذین عرفوا عبادی سبیلی و اتقونی یا اولی الالباب وانا الذی لا اسئل عما افعل وانا العلیم الحلیم وانا اذین ابلو عبادی و امتهن خلقی فمن صبر علی بلائی و محبتی اختیاری ادخلنه فی جنتی ادخلت فی نعمتی وامن زال عن امری و کنب رسلی ادخلته مهانا فی عذاب و اتممت اجلی و اظهرت امرے علی**

السنته رسلی وانا الذی لم یعل جبار لا وضعته ولا عزیز الا ذللته و بئس الذی اصره علی امره و دام علی جهالته و قال لن نبرح علیه عاکفین و به موقنین اولئک هم الکافرون یعنی تمام تعریفیں اللہ کے لیے ثابت ہیں ساتھ کلے اس کے اور برتر ہے ساتھ نام اپنے کے اور قوت دینے والا ہے اپنے دوستوں کو ساتھ اپنے کے تو کہ ہلال وقت ٹھہرے ہیں واسطے لوگوں کے ظاہر میں ان سے معلوم ہوتی ہے تعداد برسوں اور حساب اور مہینوں اور دنوں کی اور باطن ہلالون کا میرے دوستوں کے لیے ہے ایسے دوست جنہوں نے میرے بندوں کو میری راہ بتلائی ہے اور ڈرو تم مجھ سے اے صاحبان عقل اور میں وہ ہوں کہ نہیں سوال کیا جاؤں گا اس چیز سے جو میں کروں گا اور میں عالم ہوں بردبار ہوں اور میں وہ ہوں کہ مبتلا کرتا ہوں اپنے بندوں کو اور امتحان کرتا ہوں اپنی مخلوق کا جو صبر کرے گا میری بلا اور میری محبت اور میرے اختیار پر داخل کروں گا اسے میں جنت میں اور ہمیشہ رکھوں گا اس کو اپنی نعمت میں اور جس نے میرے حکم سے سرتابی کی اور میرے رسولوں کو جھٹلایا میں اس کو ہمیشہ اپنے عذاب میں ذلیل رکھوں گا اور اپنی اجل کو میں نے تمام کر دیا ہے اور میں نے اپنے امر کو رسولوں کی زبان سے ظاہر کر دیا ہے اور میں وہ ہوں کہ نہیں تعلی کرے گا کوئی سرکش مگر پست کر دوں گا میں اسے اور نہ کوئی زبردست مگر ذلیل کر دوں گا اسے اور وہ آدمی برا ہے جو اپنے کام پر اصرار کرے اور اپنی جہالت پر جما رہے اور یہ بات کہے کہ ہم اس کام پر ٹھہرے رہیں گے۔"

اس نے اپنی جماعت کے ساتھ عراق کے راستے میں حاجیوں کو پکڑ کر قتل کرایا ان کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ مکتفی خلیفہ بغداد نے قرامطہ کی سرکوبی کے لیے لشکر بھیجا جس نے ان کو مار کر بھگا دیا زکرویہ زخمی ہوا اور سات دن کے بعد مر گیا اس کا سر بغداد میں تشہیر کرایا گیا۔ قرمط نے اپنا نام قائم بالحق رکھا تھا۔ بعض آدمیوں کا خیال یہ ہے کہ قرمط فرقہ ازارقہ کی رائے کو جو خوارج کا ایک گروہ ہے پسند کرتا تھا بہر صورت اول اول قرمط نے جنگل کے رہنے والوں کو جو بے علم و بے عقل نیم وحشی تھے اپنے مذہب کی طرف بلانا شروع کیا وہ لوگ اس کی متابعت میں آ گئے اور پھر اس کے پیروں کی جماعت بڑھنے لگی

ے پیرو اپنے قول کو علم باطن کہتے۔ شرائع اسلامیہ کی تاویل کرتے اور ظاہر سے اپنے مزعومہ کی طرف پھیرتے۔ آیات قرآن کو ماول بتاتے اور یہ لوگ حرام چیزوں کو مباح ے۔ ابو الفدا میں لکھا ہے کہ شیخ قرامطہ کی شرائع میں سے یہ بات تھی کہ نبیذ کو حرام اور ب کو حلال بتاتا تھا اور جنابت یعنی ناپاکی کے بعد غسل کرنا اس کے نزدیک ضروری نہ تھا ف وضو کر لینا کافی سمجھتا تھا اور اس نے حلال کیا تھا گوشت نیش والے درندے کا جو کرتا ہو اپنے نیش سے اور ان طائر پنجہ گیر جنگل والے کو شکار کرتے ہوں اپنے چنگل ان سے جو فی الحقیقت حرام ہیں اور پارسیوں کے دو دنوں میں اس نے روزہ رکھنا تجویز تھا ایک نو روز کے دن دوسرے مہرگان کے دن کہ وہ نام ہے راہ مہر کی سولھویں تاریخ کا م الریاض سے ثابت ہوتا ہے کہ قرامطہ کو اباحیہ بھی کہتے ہیں۔ 903ء میں قرامطہ کی ت ایسی بڑھ گئی کہ انہوں نے دمشق کو گھیر لیا مگر اطراف کے لشکر نے جمع ہو کر ان کے دار پیشوا یحییٰ نامی کو قتل کر ڈالا جب یہ مارا گیا تو اس کا بھائی حسین جانشین ہوا جب اس قوت بہت بڑھ گئی تو اہل دمشق نے کچھ مال اس کو دے کر صلح کر لی پھر اس نے حمص پر ھائی کی اور اس پر غالب آیا اور اپنا خطبہ ممبروں پر پڑھوایا اور اس کا لقب امیر المومنین دی مقرر ہوا اور اپنے چچا کے بیٹے کو اس نے اپنا ولی عہد مقرر کر کے اس کا لقب مدثر ھا اور کہا کہ یہ وہی مدثر ہے جس کا ذکر قرآن میں ہے پھر حماۃ اور معرہ وغیرہ پر یورش کی ر وہاں اتنا قتل عام کرایا کہ عورتوں اور بچوں کو بھی نہیں چھوڑا پھر سلمیہ گیا اور بے جنگ ہوں قبضے میں لا کر رعایا کو مع مکتب کے لڑکوں کے جلا دیا جب اس کی حکومت بہت قوی ئی تو مکتفی خلیفہ بغداد نے تیاری کر کے اس کے استیصال کے لیے خود بغداد سے ت کی خود تورہ میں ٹھہر گیا اور قرامطہ کے پیچھے لشکر کو بھیجا 24 محرم 291ہجری کو طیوں اور بغدادیوں میں حماۃ سے دس کوس کے فاصلے پر جنگ ہوئی قرامطہ کو شکست ا حسین اور اس کا چچا زاد بھائی مدثر خلیفہ کے حضور میں گرفتار ہو کر آئے۔ خلیفہ نے ن کی گردن مروا دی اور حسین کا سر تشہیر کرایا۔ اس کے بعد زکرویہ بن مہرویہ نے ن کی سرغنائی کی۔ تین سال کے بعد 905ء میں مکتفی کے ہاتھ سے اس کی تمام شاہ و

شوکت برباد ہو گئی اور وہ خود بھی مارا گیا۔ صناحتہ الطرب میں لکھا ہے کہ قرامطہ نے ا
پھریروں کا رنگ سفید رکھا تھا۔ نزہتہ الجلیس میں لکھا ہے کہ 293 ہجری (906ء) کو
سے یمن میں ایک قرسطی داخل ہوا اس کا نام علی بن فضل تھا یہ شخص یمنی تھا نسب ا
خنفری تھا کہ خنفر بن سباء الاصغر کی اولاد میں سے تھا اس زمانے میں صنعاء یمن کا
مکتفی بن معتضد عباسی کی طرف سے اسد بن ابی جعفر تھا یہ قرمطی نہایت بد مذہب تھا
کو نبوت کا دعویٰ تھا اس کی مجلس میں ایک شخص پکار کر کہتا **اشهدان علی بن الفض**
رسول الله اس نے اپنے اصحاب کے لیے شراب پینا اور بیٹیوں کے ساتھ نکاح کرنا
کر دیا تھا اور جب اپنے کسی معتقد کو تحریر کرتا تو عنوان تحریر کا یوں ہوتا **من باسط الار**
و داحیها و مزلزل الجبال و مرسیها علی ابن الفضل الی عبده فلاں یعنی
تحریر ہے زمین کے پھیلانے والے اور ہانکنے والے اور پہاڑوں کے ہلانے والے اور ٹھ
والے علی پسر فضل کی جانب سے فلاں بندے کے نام اس نے اپنے مذہب میں تمام
چیزوں کو حلال کر دیا تھا بعض اشراف بغداد نے اس کی ہلاکت کی فکر کی اور 916ء میں
دے کر مار ڈالا۔

. تاریخ الخلفا میں سیوطی نے اور طبقات دلائل اسلام میں ذہبی نے 914ء کے و
قلمبند کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خلیفہ مقتدر عباسی کے عہد میں حسین بن منصور حلا
اونٹ پر سوار کر کے تشہیر کیا پھر اسے لٹکا کر منادی کرائی گئی کہ یہ فرقہ قرامطہ کا داعی
اور قید کر دیا یہاں تک کہ 922ء میں قتل کروا ڈالا اور لوگوں میں یہ بات مشہور ہوئی
الوہیت کا مدعی تھا اور حلول کا قائل تھا جبکہ رئیس قرامطہ ابوطاہر سلیمان بن ابو سعید
بن بہرام قرامطی کے حوالہ سے کتب تواریخ میں لکھا ہے کہ حلاج ساحر تھا اور عبداللہ
املاک کوفی کا شاگرد تھا۔

عقائد معتزلہ:

معتزلہ فرقہ کا رئیس اور پیشوا واصل تھا۔ اس نے احادیث و اخبار کی تعلیم

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی تھی اور قواعد اعتزالہ عبداللہ بن محمد حنیفہ سے سیکھے تھے۔
معتزلہ نے اپنا لقب اصحاب عدل و توحید اختیار کیا اور وہ حضرت علیؓ کی فضیلت کے قائل
تھے اس لیے یہ بات بہت کم ہے کہ کوئی شخص معتزلی ہو اوز شیعہ نہ ہو۔ وہ صفات الوہیت
کی نفی کرتے تھے اور ان کے مطابق صفات الہٰی ذات الہٰی سے جدا نہیں ہیں بلکہ تمام ایک
ذات ہے اور ایک ہی مفہوم۔ ان کے نزدیک جن اوصاف الہٰی میں اثبات و نفی جاری
ہو سکتی ہے انہیں صفات فعل اور جن میں نفی جاری نہ ہو سکے صفات ذات ہیں اور کلام اور
ارادہ اور صفات فعل میں شامل ہیں۔ بعض کے نزدیک ارادہ اور امر الہٰی دونوں متحد ہیں
اور بعض کے نزدیک ارادے کو امر لازم ہے۔ معتزلہ کے نزدیک اس بات پر کامل اتفاق
ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال اور احکام معطل ہیں مخلوق کی مصلحتوں کی رعایت کے ساتھ اللہ
کا کوئی کام ایسا نہیں جو غرض سے خالی ہو اور غرض میں بندوں کی بھلائی اور بہتری مضمر نہ
ہو۔ اللہ تعالیٰ کا کلام حروف اور آواز سے مرکب اور حادث ہے۔ قدیم نہیں اللہ تعالیٰ
جب چاہتا ہے اسے کبھی لوح محفوظ میں پیدا کر دیتا ہے۔ کبھی جبرائیل میں اور کبھی نبیا میں
اور کلام نفسی اور کلام لفظی میں کوئی تفریق واضح نہیں ہے۔ قرآن مخلوق ہے اور خدا کا
جدید کلام ہے جو نبی پر نازل ہوا۔

مامون الرشید سے واثق تک اس عقیدہ کا بڑا چرچا رہا۔ احمد بن حنبل اور محمد بن
نوح کو بیڑیاں پہنائی گئیں اذیتیں اور قید کی صعوبتیں دی گئیں۔ کئی لوگ قتل کر دیئے گئے۔
متوکل واثق نے ان تکلیفوں کا خاتمہ کیا۔ ان کے عقائد کے مطابق اللہ تعالیٰ کے اسمائے
صفات و افعال توفیقی ہیں۔ رضا مندی اور ناراضی اللہ تعالیٰ کی صفات نہیں ہو سکتی ہیں۔
دیدار الہٰی کے قائل نہیں۔ اشیاء میں حسن قبیح عقلی ہے بندہ اپنے افعال اختیار کا خالق
ہے۔ جو شخص ارکان دین کا اعتقاد بطور تقلید رکھتا ہے تو وہ شخص نہ مومن ہے اور نہ کافر۔
اللہ تعالیٰ نے کسی سے بھی بشمول آدم' نوح' ابراہیم' موسیٰ' عیسیٰ' رسول اللہ' جبریل'
میکائیل' اسرافیل علیہم السلام اور نہ حاملان عرش سے کلام کیا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا
وہ معراج' کرامات اولیاء اور آنحضرت کی فضیلت کے بھی قائل نہیں تھے۔ معتزلہ کو اہل

سنت سے ان پانچ باتوں سے اختلاف تھا۔ مسئلہ صفات، مسئلہ رویت، مسئلہ وعدہ و عید، مسئلہ ایجاد و افعال اور مسئلہ مشیت۔ اسے معتزلہ تسلیم نہیں کیا جاتا تھا جو قرآن کو غیر مخلوق قرار دے اور یہ کہے کہ بندے کے سارے افعال اللہ کی قضا و قدر سے ہیں۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دیدار ہونے کا اقرار کرے، صفات الٰہی جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں ثابت کرے اور صاحب کبیرہ کو دائرہ ایمان سے خارج نہ کرے۔

آیئے اب ان تمام عقائد کی روشنی میں حلاج کے نظریات کا بہ عمیق جائزہ لیتے ہیں تاکہ حلاج پر لگائے گئے الزامات کی قلعی کھل سکے۔

نظریات ابن منصور

حلاج مذہباً" سنی العقیدہ تھے لیکن تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ وہ آئمہ اربعہ میں کس مسلک کی طرف زیادہ رجحان رکھتے تھے۔ البتہ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ ان کے آخری ایام زندگی میں حنبلہ نے ان کی طرفداری کی تھی۔ حلاج نے سزائے موت سن کر یہ اعلانیہ کہا تھا کہ میرا دین اسلام ہے اور مذہب سنت ہے۔ ابوالقاسم قشیری نے ان کے تزکئے کی طرف اشارہ کر کے ان کا عقیدہ اہل سنت بتایا ہے۔ جہاں تک درپردہ شیعہ ہونے کا تعلق ہے تو بادی النظر میں یہ درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ان کے قتل میں شیعہ کی دو معتبر اور مقتدر شخصیات ابن الغرات اور شلمغانی کا بڑا ہاتھ تھا جنوں نے خلیفہ اور اس کی والدہ کی اس خواہش کے برعکس کہ ابن منصور کو کوئی گزند نہ پہنچے دربار میں بااثر غالیوں سے مل کر ابن منصور کو تختہ دار پر چڑھا کر چھوڑا۔

ابن منصور کے نظریات کا اندازہ ان کی تصنیفات سے کیا جا سکتا ہے۔ ابن ندیم نے الفہرست میں ابن منصور کی چھیالیس کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ اسماعیل پاشا نے بھی یہی تعداد بتائی ہے۔ البتہ انہوں نے اپنی فہرست میں کتاب الجیم الاصغر اور کتاب الجیم الاکبر کا بھی ذکر کیا ہے جو ابن ندیم کی فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ متذکرہ کتب ترتیب بمطابق حروف تہجی اسی طرح ہے۔

(1) کتاب الابدو المابود (2) کتا الاحرف المحدثہ والاریتہ الاسماء ا لکلیتہ (3) کتاب الاصول و الفروع (4) کتاب الامثال و الابواب (5) کتاب تفسیر قل ھو اللہ احد (6) کتاب التوحید (7) کتاب حمل النور و الحیاۃ والارواح (8) کتاب خزائن الخیرات و یعرف بالالف المقطوع و الالف المالوف (9) کتاب خلق الانسان و البیان (10) کتاب خلق خلائق القرآن و الاعتبار (11) کتاب الدرۃ الی نصرا لقشوری (12) کتاب الذاریات ذرو (13) کتاب سرالعالم و المبعوث (14) کتاب السمری و جوابہ

(15) کتاب السیاستہ الی الحسین بن حمدان (16) کتاب السیاستہ و الخلفاء و الامراء (17) کتاب شخص الظلمات (18) کتاب الصدق و الاخلاص (19) کتاب الصلوۃ و الصلوات (20) کتاب الصیهون (21) کتاب طاسین الازل و الجوهر الاکبر و الشجرۃ الزیتوا نیتہ النوریتہ (22) کتاب الظل الممدود و الماء المسکوب و الحیاۃ الباقیتہ (23) کتاب العدل و التوحید (24) کتاب علم البقاء و الفناء (25) کتاب الغریب الفصیح (26) کتاب فی ان الذی انزل علیک القرآن لرادک الی معاد (27) کتاب قران قرآن و الفرقان (28) کتاب القیامتہ و القیامات (29) کتاب الکبر و العظمتہ (30) کتاب الکبریت الاحمر (31) کتاب کید الشیطان و امر السلطان (32) کتاب کیف کان و کیف یکون (33) کتاب الکیفیتہ بالمجاز (34) کتاب الکیفیتہ و الحقیقتہ (35) کتاب لا کیف (36) کتاب المتجلیات (37) کتاب مدح النبی و المثل الاعلی (38) کتاب مواید العارفین (39) کتاب النجم اذا ہوی (40) کتاب نور النور (41) کتاب الوجود الاول (42) کتاب الوجود الثانی (43) کتاب هو هو (44) کتاب الهیاکل و العالم و العالیم (45) کتاب الیقظتہ و بدوا لخلق (46) کتاب الیقین۔

حسین بن منصور کی اکثر و بیشتر تصانیف کا موضوع تصوف و الہیات اور علم کلام اور فلسفہ ہے لیکن بعض تصانیف میں اس وقت کے سیاسی حالات اور سلاطین کے احوال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

○ متذکرہ بالا کتب ابن منصور کے درج ذیل نظریات و عقائد کی تفصیل بیان کرتی ہیں۔

○ پاک ہے وہ ذات جس نے پہچانا سوتی شکل میں اپنی منور لاہوتی ذات کو اور پھر وہ اپنی مخلوقات کے سامنے ایک کھانے اور پینے والے انسان کی شکل میں ظاہر ہوا۔

○ آدم سے خدا کا اشتراق نہیں ہوا اسے غیر وجود تخلیق کیا گیا ہے۔

○ باری تعالیٰ کی وحدی (UNITY) صوفی کی شخصیت کو تباہ نہیں کرتی

یہ اسے زیادہ مشکل کرتی ہے اسے زیادہ معتبر' زیادہ الہیاتی' خودمختار اور زندہ چیز بناتی ہے۔

○ تیری روح میری روح میں اسی طرح گھل مل گئی ہے جس طرح شراب صاف پانی میں گھل مل جاتی ہے۔

○ کوئی شے جب تجھے مس کرتی ہے تو مجھے مس کرتی ہے۔ کیا مزے کی بات ہے کہ ہر حال میں تو "میں" ہے۔

○ میں وہی تو ہوں جسے میں چاہتا ہوں یا محبت کرتا ہوں اور وہ جس سے میں محبت کرتا ہوں' میں ہے۔ ہم دو روحیں ہیں جو ایک ہی جسم میں رہتی ہیں۔ اگر تو مجھے دیکھتا ہے تو گویا اسے دیکھتا ہے اور اگر تو اسے دیکھتا ہے تو گویا ہم دونوں کو دیکھتا ہے۔

○ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے حدوث کو لازم کر دیا ہے' کیونکہ قدیم ہونا اس کے لئے مخصوص ہے۔

○ جس چیز کا ظہور جسم سے ہے اس کے لئے عرض لازم ہے اور جو چیز آلات و اسباب سے مجتمع ہوتی ہے اس کی قوتیں اس کو تھامے ہوئے ہیں اور جس چیز کو ایک وقت مجتمع کرتا ہے دوسرا وقت اس کو متفرق کر دیتا ہے جس کو اس کا غیر قائم کرتا ہے۔

○ جس کو محل اور مکان اپنے اندر لئے ہوئے ہے اس کو کیفیت مکانی محیط ہے جو کسی جنس کے تحت میں ہے۔ اس کے لئے کیف اور ممیز ہونا لازم ہے کیونکہ جنس کے تحت میں انواع ہوتی ہیں اور ہر نوع دوسری نوع سے کسی فصل کے ذریعہ ممتاز ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ پر نہ کوئی مکانی فوق سایہ فگن ہے نہ کوئی مکان تحت اس کو اٹھائے ہوئے ہے۔ کوئی حواس کے سامنے نہیں اور کوئی قریب و نزدیک اس کا مزاحم نہیں' نہ کوئی اس کو اپنے پیچھے لے سکتا ہے نہ سامنے ہو کر اس کو محدود کر سکتا

ہے، نہ اولیت نے اس کو ظاہر کیا نہ بعدیت نے اس کی نفی کی، نہ لفظ کل نے اس کو اپنے اندر لیا۔ نہ لفظ کان نے اس کو ایجاد کیا۔ نہ لیس نے اس کو مفقود کیا۔

○ اس کے وصف کے لئے کوئی تعبیر نہیں اس کے فعل کی کوئی علت نہیں، اس کے وجود کی کوئی نہایت نہیں۔

○ وہ اپنی مخلوق کے احوال سے منزہ ہے اس کو اپنی مخلوق سے کسی قسم کا امتزاج نہیں، نہ اس کے فعل میں آلات و اسباب کی احتیاج، وہ اپنی قدامت کے سبب مخلوق سے الگ ہے جب کہ مخلوق اپنے حدوث کے سبب اس سے الگ ہے۔

○ اگر تم کہو وہ کب ہوا؟ تو اس کا وجود وقت سابق ہے۔ اگر تم "ہو" کہو تو ہا اور واؤ اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور مخلوق سے خالق پر اشارہ نہیں ہو سکتا۔ محض یاد کے درجے ہیں ناتمام تصور ہو سکتا ہے۔ اگر تم کہو وہ کہاں ہے؟ تو ہر مکان سے اس کا وجود مقدم ہے، حرف اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔

○ اس کا وجود ہی اس کا مثبت ہے اور اس کی معرفت یہ ہے کہ اس کو واحد جانو اور توحید یہ ہے کہ مخلوق سے اس کو ممتاز سمجھو، جو کچھ وہم کے تصور میں آتا ہے وہ اس کے غیر کا ہے۔

○ جو چیز اسی سے پیدا ہوئی وہ اس میں کیونکر حلول کر سکتی ہے کیونکہ حال و محل میں اتحاد ہوتا ہے اور حادث قدیم کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتا اور جس چیز کو اس نے نشو و نما دیا۔ اس کی طرف کیونکر پہنچ سکتی ہے، آنکھیں اپنے اندر اس کو نہیں لے سکتیں اور گمان اس کے پاس تک نہیں پہنچ سکتا۔

○ اس کا قرب یہ ہے کہ مکرم بنا دے اور بعد یہ ہے کہ ذلیل کر دے۔

○ اس کی بلندی چڑھائی کے ساتھ نہیں اس کا آنا بدون انتقال کے ہے۔

○ وہ اول بھی ہے آخر بھی، ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ہے، قریب بھی ہے اور بعید بھی اس کی مثال مثل کوئی شے نہیں وہ ہی سننے والا دیکھنے والا ہے۔

○ جو شخص حقیقت توحید سے آشنا ہو جاتا ہے اس کے دل و زبان سے غم و کیف و چوں و چرا ساقط ہو جاتا ہے۔ ہر حال میں اللہ سے راضی رہتا ہے اور ہر حکم اور ہر تقدیر کے سامنے گردن تسلیم خم کر دیتا ہے۔

○ فراست یہ ہے کہ جب حق کسی لطیفہ پر غالب ہو جاتا ہے تو اس کو اسرار کا مالک بنا دیتا ہے، اب وہ اس کا معائنہ کرنے لگتا ہے اور بیان میں بھی لاتا ہے۔

○ صاحب فراست اول نظر میں مقصد تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ کسی تاویل اور ظن و تخمین کی طرف التفات نہیں کرتا۔

○ نبی کریم کی روشنی کائنات کی تخلیق سے قبل تھی ان کا نام الہیاتی فلک سے پہلے موجود تھا وہ سب نوع انسان سے قبل تخلیق کئے گئے اور وہ نبی نوع انسان کے سردار ہیں ان کا نام گرامی احمد ہے۔

○ حق وہ ہے جو مخلوق کے لئے علتیں پیدا کرنے والا ہے اور خود کسی علت کا معلوم نہیں۔

○ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اسم کے حجاب میں رکھا ہے تو وہ زندہ ہیں اور اگر علوم قدرت ان کے لئے ظاہر کر دیئے جاتے تو ان کے ہوش و حواس جاتے رہتے اور اگر حقیقت منکشف کر دیئے جاتے تو مرجاتے۔

○ اللہ تعالیٰ کے اسماء فہم و ادراک کی جہت سے تو اسم ہیں اور واقع کے اعتبار سے حقیقت۔

جب بندہ مقام معرفت تک پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے خواطر کا اسے الہام فرماتے ہیں اور اس کے باطن کو غیر خاطر حق کے گزرنے سے محفوظ کر دیتے ہیں اور عارف کی علامت یہ ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں سے خالی ہو جائے۔

تم حق تعالیٰ سے منفصل ہو اور نہ اس سے متصل۔

ابلیس بہت بڑا موحد تھا اس نے اپنے رب کا بھی وہ حکم نہیں مانا جس سے شرک کی بو پائی جاتی تھی۔

صوفی وہ ہے جس کی ذات تنہا ہوتی ہے اسے کوئی قبول نہیں کرتا وہی اللہ کا پتہ دینے والا اور اللہ کی طرف اشارہ کرنے والا ہوتا ہے۔

جب بندہ ہمیشہ ابتلا میں رہتا ہو اس سے مانوس ہو جاتا ہے۔

اپنے نفس کی نگہداشت رکھو۔ اگر تم اسے حق میں نہ لگاؤ گے تو وہ تم کو حق تعالیٰ سے ہٹا دے گا۔

جو اپنے اول قصد سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو۔ پھر ادھر ادھر مائل نہ ہو یہاں تک کہ واصل ہو جائے اسے مرید کہتے ہیں۔

تصوف کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ جو تم دیکھ رہے ہو۔

جو شخص اعمال پر نظر رکھے گا معمول سے محجوب ہو جائے گا اور معمول، پر نظر رکھے گا وہ اعمال پر نظر کرنے سے روک دیا جائے گا۔

جو شخص غیر اللہ پر نظر کرتا ہے یا غیر اللہ کا ذکر کرتا ہے اس کو جائز نہیں ہے کہ کہے کہ میں نے اللہ واحد کو پہچان لیا ہے جس سے تمام آحاد ظاہر ہوئے۔

جس شخص کو انوار توحید نے مست کر دیا ہو وہ تجرید کی عبادت سے روک دیا جاتا ہے۔

جو شخص نور ایمان سے حق تعالیٰ کو تلاش کرنا چاہتا ہے وہ ایسا ہے

جیسے کوئی آفتاب کو ستاروں کے انوار سے تلاش کرے۔

حق تعالیٰ کے ساتھ رہو اس سے حق تعالیٰ کی محبت تم کو حاصل ہو گی۔

خدا ہی ہر قسم کے لوگوں کو پیدا کرنے والا ہے۔ وہی انہیں راستے کا پتہ بتانے والا ہے حکمت ایک تیر، خدا تیر انداز اور مخلوق نشانہ ہے۔

الٰہی پر حق کی ایک حقیقت ہے اور ہر مخلوق کے لئے ایک طریقہ ہے۔ ہر عہد کی ایک مضبوطی ہے۔

انس معہ اللہ سے بڑھ کر کون سی جنت ہو گی۔ خوشحالی ہے ایسے نفس کے لئے جو مولا کا مطیع ہو اور حقیقت کے آفتاب اس کے قلوب میں چمک رہے ہوں۔

جس نے یہ گمان کیا کہ الوہیت بشریت کے ساتھ یا بشریت او ہیت کے ساتھ مخروج ہو سکتی ہے تو اس نے کلمہ کفر کہا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات کے اعتبار سے خلق کی ذوات اور صفات سے متفرد ہے۔ کسی وجہ سے بھی اللہ تعالیٰ کی ذات اور خلق کی ذوات میں مشابہت نہیں ہے اور قدیم اور محدث میں مشابہت ہو بھی کیسے؟ اور جس نے یہ غلط خیال کیا کہ باری تعالیٰ کسی مکان میں ہے یا کسی مکان سے متصل ہے یا کسی مکان کے اوپر ہے یا کسی ضمیر میں متصور ہو سکتا ہے یا اوہام میں متخیل ہو سکتا ہے یا کسی نعمت یا صفت کے تحت داخل ہو سکتا ہے تو وہ مشرک ہے۔

صبر کا مطلب یہ ہے کہ مصائب و تکالیف کی چکی میں پسنے والا اف تک نہ کرے۔ سولی پر چڑھا کر اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے جائیں مگر اس کے لبوں پر پروردگار کے لئے شکوہ نہ نکلے۔

جنت کو جانے والا راستہ دو قدموں کا ہے تم صرف دو قدم چل کر اس تک پہنچ سکتے ہو۔ پہلا قدم یہ ہے کہ دنیا کو اس کے عاشقوں کے منہ

پر مار دو اور دوسرا قدم یہ ہے کہ آخرت کو اس کے چاہنے والوں کے حوالے کر دو۔

وحدت حق عارف کی خودی کو محو نہیں بلکہ اسے اور بھی زیادہ کامل، مقدس اور الوہی بنا کر ایک آزاد و زندہ عضو بنا دیتی ہے۔

خدا نے دو طرح کے اثر پیدا کئے ہیں ایک عام قسم کے دوسرے خاص قسم کے۔ سبھی اپنے اپنے حصے کا کام سرانجام دیتے ہیں اس لئے موسیٰ علیہ السلام پیغمبر خدا تھے اور فرعون بھی سچا تھا۔

فوق اللہ تعالیٰ پر سایہ نہیں کرتا اور تحت اسے سہارا نہیں دے سکتا، حد اس کے مقابل نہیں عند اس کا مزاحم نہیں، خلف اسے اخذ نہیں کر سکتا، امام اسے محدود نہیں کر سکتا، کان اسے پا نہیں سکتا۔ لیس، اسے کم نہیں کر سکتا۔

اس کا وصف یہی ہے کہ اس کا وصف بیان نہیں ہو سکتا، اس کے فعل کی کوئی علت نہیں، اس کی ہستی کی کوئی انتہا نہیں، وہ خلق کے احوال سے منزہ ہے، خلق اس سے پیوست نہیں ہو سکتی۔ اس کے فعل میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ وہ مخلوقات سے اپنے قدم کے اعتبار سے جدا ہے اور مخلوقات اپنے حدوث کے اعتبار سے اس سے جدا ہیں۔ اگر تو کہے متی تو اس کا وجود وقت پر سابق ہے اور اگر تو کہے "ھو" تو ھا اور واوَ اسی کی مخلوق ہیں اور اگر تو کہے "ابن" تو اس کا وجود مکان پر مقدم ہے۔ اس کی معرفت اس کی توحید ہے اور اس کی توحید، خلق سے اس کی ممیز ہے، جو کچھ اوہام انسانی میں متصور ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے خلاف ہے۔ جو اس سے پیدا ہوا ہے وہ کیسے اس کے ساتھ حال بن سکتا ہے؟ اور جسے اس نے پیدا کیا ہے وہ کیسے اس تک جا سکتا ہے؟ آنکھیں اس کا مماثل نہیں کر سکتیں اور اوہام و ظنون اس کا تقابل نہیں کر سکتے۔

اس کا قرب اس کی کرامت ہے اور اس کا بعد اس کی اہانت ہے۔ وہی اول ہے وہی آخر ہے وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے۔ اس کی مثل کوئی شی نہیں ہے۔

حلاج کا ایک قصیدہ ہے۔

اقتلونی یا ثقاتی
الی فی قتلی حیاتی
و مماتی فی حیاتی
و حیاتی فی مماتی

میں نے ادیان کے بارے میں گہرے تفکر میں تحقیق کی اور انہیں کئی شاخوں والی جڑوں کی طرح پایا۔ کسی سے اس کے دین کے بارے میں مت پوچھو اسے جڑ سے جدا کر دیتا ہے اصل اسے ڈھونڈ لے گا جیسے جیسے معنی آشکار ہوں گے وہ جان لے گا۔

نعرہ اناء الحق

میں کہتا ہوں
اگر میں اپنے قول اور ان پر تعلم سے منکر ہوتا تو
حلقہ عزت سے خارج ہو چکا ہوتا

....

اور میں نے کہا
اگر تم حق شناس ہو تب اس کی نشانیاں
پہچانو' میں اس کی نشانی ہوں
اناء الحق
اور یہ اس لئے کہ میں نے حق سے منہ نہ موڑا
مجھے ہلاک کر دو
تختہ دار پر لٹکا دو
میرے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دو
میں اپنے دعویٰ سے نہ منکر ہوں

○

اناء الحق کا جملہ ابن منصور کی مشہور تصنیف کتاب الطواسین میں مرقوم ہے۔ اس کتاب میں ابن منصور نے اپنے عقیدے کو بڑے دقیق منطقی پیرائے میں مبہم اور فنی مصطلحات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حلاج کی "دریافت نو" کا سہرا فرانس کے شہرہ آفاق مستشرق لوئی ماسینیون کے سر ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے پچپن سال اس متنازعہ فیہ لیکن فکری اعتبار سے انتہائی بااثر صوفی شخصیت کی سوانح حیات اور اس کے نظریات کی تحقیق میں صرف کر دیئے۔ ماسینیون نے تصانیف حلاج کے قلمی نسخوں کو تلاش کیا اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گراں قدر مقالات سپرد قلم

کیئے اور یہ اس کی تحقیقات کا اثر ہے کہ صدیوں سے منصور کی شخصیت کے متعلق نیم تاریخی واقعات' افسانوی روایات اور متضاد بیانات مقبول عام ہو گئے تھے' ان کی اہمیت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور عالمانہ سطح پر اس کے نظریات کے مطالعے کا آغاز ہوا۔ جب حلاج کی مستند کتابیں مطبوعہ صورت میں دستیاب ہوئیں اور مفکرین نے ان کا بالا استیعاب مطالعہ کیا تو علامہ اقبال جیسی معتبر ہستی کے خیالات میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔

پروفیسر لوئی ماسینیون جو 25 جولائی 1883ء کو SUR_ MORNE/ NOGENT_ کے مقام پر پیدا ہوا تھا نے 24 مئی 1922ء کو حلاج (PASSION) اور اسلامی تصوف (ESSAI) پر دو مقالات برائے ڈاکٹریٹ پیش کیے۔ اس کی اشاعت کے بعد اسے کئی نئی باتوں کا پتہ چلا اور وہ ابھی ان معلومات کی روشنی میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن مرتب کرنے میں مشغول تھا کہ 31 اکتوبر 1962ء کو اس کا پیرس میں انتقال ہو گیا۔

لوئی ماسینیون کی یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد دس اور دوسری جلد پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں حلاج کے حالات زندگی' دور تربیت' سفر اور ولائت' دعوت عام اور سیاسی الزام تراشی' فرد جرم' کاروائی مقدمہ' شہادت' حلاج اور اسلام' حلاج اور تصوف اور قصص و روایات منقول ہیں۔ جبکہ دوسری جلد میں صوفیانہ دینیات' اعتقاد دینیات پر بحث' قانونی نتائج' عقیدے کے ثبوت میں دلائل کے علاوہ تصانیف حلاج اور ان کے ماخذ کی فہرست دی گئی ہے۔

ابن منصور کا مشہور نعرہ اناء الحق کتاب الطواسین میں مرقوم ہے۔ ماسینیون نے حلاج کی اس کتاب کا متن برٹش میوزیم سے حاصل کر کے ولی الدین آفندی کے مخطوطات کو سامنے رکھ کر مرتب کیا۔ کتاب الطواسین کا ایک قلمی نسخہ مشہد میں موجود ہے اور فارسی شرح کے جس متن کو ماسینیون نے استعمال کیا وہ مراد ملا کے

کتب خانے میں پڑا ہے۔ اس کتاب کا مکمل فرانسیسی ترجمہ (PASSION) اور انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب کی تدوین میں ماسینیون نے جن سات قلمی نسخوں سے استفادہ حاصل کیا ان کی تفصیل اس طرح سے ہے۔ مخطوطہ مدرسہ احمد افندی' الحیاط' موصل (بحوالہ کتاب مخطوطات الموصل' تالیف الدکتور داؤد چلبی الموصلی' مخطوطہ قازان' مکتبہ الشرقیتہ المرکزیتہ' نسخہ در مجموعہ' احمد تیمور پاشا درکتاب خانہ شاہی قاہرہ' مخطوطہ کتب خانہ سلیمانیہ' استانبول' مخطوطہ برٹش میوزیم' ماسینیون کے ذاتی کتب خانے کا نسخہ' جو اس نے 27 دسمبر 1912ء میں قاہرہ سے خریدا تھا اور مخطوطہ کتاب خانہ شاہی' برلین۔

طواسین سورتہ 26-28 کے حروف مقطعات کا مجموعہ ہے اور اس کا مفہوم لفظ سجدہ کے گرد پھیلا ہوا ہے۔ یہ کتاب عربی نثر میں لکھی گئی اور گیارہ مختصر فصول پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں حلاج نے عقیدہ ولائت اور اپنے ذاتی تجربوں کی وضاحت کی ہے۔ یہ کتاب دراصل حلاج کی فکری سرگزشت ہے جس میں وہ عقائد اور فکری منطقی استدلال سے پیدا ہونے والی کشکش کو زیر بحث لاتا ہے اور استدلالی ڈھانچہ کو عقل خرد کے ذریعے ناقابل اعتماد قرار دیتا ہے۔ اسکا محوری نقطہ نبی کریم ﷺ کی ذات پاک' واقعہ معراج اور حقیقت نور محمدیہ ہے۔ اس کے گیارہ باب ہیں۔

پہلے باب طاسین السراج میں ماخلق اللہ نوری کو ثابت کیا گیا ہے' دوسرے باب طاسین الفہم میں ثابت کیا گیا ہے کہ حقائق کا ادراک کرنا مخلوق کے بس کی بات نہیں پروانہ شمع کی ذات میں گم ہو جاتا ہے اور اپنی ہستی کو فنا کر دیتا ہے۔ اس پر کیا گزرتی ہے؟ اس کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ مشاہدہ تجلی ذات کے اس اصلی مقام پر سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی شخص فائز نہیں ہو سکا۔ اس ظلمت کدہ دھر میں نور حقیقت کا علم بہت دشوار ہے چہ جائے کہ اس کا احساس باقی رہے۔ پھر وہ احساس اتنا پختہ ہو جائے کہ انسان اپنے آپ کو اس حقیقت میں گم

کر دے۔ یہ مقام ہر کس و ناکس کو نہیں مل سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ مقام بہت بلند مقام ہے۔ اس تک رسائی سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ معراج کا واقعہ آپ کے مقام کی بلندی کی خبر دیتا ہے اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے طاق جس میں چراغ ہو اور وہ چراغ شیشہ یعنی فانوس میں رکھا ہوا ہو۔ شیشہ گویا چمکتا تارا ہے اور چراغ اس بابرکت درخت زیتون سے جلایا گیا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی اس کا تیل اگرچہ آگ نے اسے چھوا نہ ہو پھر بھی وہ لگتا ہے کہ چمک اٹھے گا۔ روشنی پر روشنی' اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ آدمیوں کے لئے یوں مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

طاسین الصفا میں سالک کو بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ایک سالک کا دل چالیس مقامات سے گزر کر ذات باری تعالیٰ کی تجلیوں کا جلوہ گاہ ہو سکتا ہے۔ اس مقام کی بلندیوں پر بھی آنحضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اور کوئی فائز نہیں ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ مقام ملا مگر وہ یہاں بھی صاحب خبر ہیں جبکہ آپ ان کے مقابلہ میں صاحب نظر ہیں اور نظر کا درجہ خبر سے ارفع ہے۔ اس کے بعد حسین بن حضور کہتا ہے کہ "میری مثال بھی ایسی ہے جو کچھ میں کہتا ہوں وہ اس کی طرف سے ہوتا ہے بلکہ تعجب کی بات ہے کہ درخت سے " انا اللہ" کی آواز آئے تو کوئی حرج نہیں اور مجھ سے "ان الحق" کی صدا بلند ہو جائے تو انکار اور مواخذہ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ طاسین الصفاء میں یہ بات بھی بتلائی گئی ہے کہ حقیقت تک رسائی بہت دشوار ہے اس کا راستہ آگ کا سمندر ہے جو ایک سالک کو طے کرنا پڑتا ہے۔ ان کٹھن منزلوں سے گزر کر آئینہ دل میں صفا اور پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ پھر حقیقت کا عکس اس میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ حلاج نے یہاں چالیس مقامات گنوائے ہیں جن کو عبور کر کے سالک اہل صفا و صفوف کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔ اس عبادت میں چالیس کا عدد قابل غور ہے اور یہ غالباً" چلہ کشی

کی مشقوں کی جانب اشارہ ہے چونکہ اس طاسین میں ہی حضرت موسیٰ علیہ اسلام کا ذکر بھی ہے جن کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ "اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے تیس رات کا وعدہ کیا اور ان تیس میں دس اور ملا کر ان کو پورا کیا۔ پھر اس کے رب کا وعدہ چالیس رات کا پورا ہوا۔" اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جس وقت نبوت عطا فرمائی گئی اس وقت آپ کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ حکماء کا قول ہے کہ انسان میں تین قوتیں پائی جاتی ہیں' 1- نفس حیوانی جس کا ظہور ابتدائے آفرینش سے ہو جاتا ہے۔ 2- نفس انسانی' جب انسان شعور و عقل کی منزلوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور 3- نفس ملکوتی' جب اس میں وجدان اور عرفان کی چنگاری جاگ اٹھتی ہے اور وہ حقائق اور اسرار کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ یہ قوت چالیس سال اور اس کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اے صوفی شراب عرفان اس وقت شیشہ دل میں صاف ہو گی جب اس پر چالیس سال بیت جائیں گے۔ اس حقیقت کی طرف اس آیت میں بھی اشارہ ملتا ہے۔ "یہاں تک کہ جوان ہوا اور چالیس سال کی عمر کو پہنچا تو کہنے لگا کہ اے رب مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکریہ ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے ماں باپ کو عطا کی ہیں اور یہ بھی کہ میں ایسے کام کروں جس سے تو خوش رہے اور تو میری اولاد کو میرے لئے ٹھیک کر دے۔ میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں تیرے فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ اس کے بعد حلاج نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقام کا مقابلہ کیا اور بتلایا ہے کہ قرآن شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو مقام نظر سے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقام کو مقام خبر سے تعبیر کرتا ہے۔ اہل دل کے نزدیک مقام نظر مقام خبر سے بہت بلند ہے۔ پھر حلاج نے اپنی طرف اشارہ کیا ہے کہ میں تو نشان راہ پر چلنے والا ہوں۔ مقام نظر اور خبر دونوں سے دور ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ درخت سے سنا وہ درخت کی آواز نہیں تھی بلکہ حق تعالیٰ کی آواز تھی۔ اس

لئے جو کچھ میں کہتا ہوں اسے بھی میرا کلام نہ سمجھنا چاہئے۔ ایک درخت اللہ کی تجلی کا مرکز بن جائے تو عجب نہیں لیکن اگر ایک انسان جو اشرف المخلوقات ہے اگر وہ کسی تجلی کا مرکز ہو جائے تو پھر کیونکر عجب ہو؟ آخر میں حلاج نے ثابت کیا ہے کہ خدا کی کوئی زبان نہیں ہے اور نہ اس کے کلام کا کوئی زبان احاطہ کر سکتی ہے۔ جس کو ہم حقیقت اور معرفت کہتے ہیں اس کی تعلیم بھی اس نے ہماری صلاحیت' ہمارے شعور اور ہمارے قلوب کے مطابق خود ہماری زبان میں دی ہے۔

طاسین الدائرہ میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ علم و معرفت کے اعتبار سے ایک درجہ ظاہری معلومات کا ہے۔ اس درجہ کا آدمی حقیقت الحقیقت تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس درجہ سے بلند تر دائرہ علم کا ہے آدمی وہاں تک پہنچ تو سکتا ہے مگر اس مقام پر متمکن نہیں ہو سکتا اور وہیں اس سے اس کی اہمیت اور بازگشت شروع ہو جاتی ہے۔ ان دونوں سے اوپر تیسرا دائرہ کمال عرفان کا ہے۔ وہاں عارف حقیقت الحقیقت کی گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں ظاہر و باطن اور اشکال و الوان کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ اس درجہ کمال پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدرجہ اتم فائز ہیں اور آپ کے ماننے والوں کو اس مقام کی اطلاع دی گئی ہے۔ اس طاسین میں حلاج نے تین دائروں کا ذکر کیا ہے پہلے دائرہ سے عالم ملک مراد ہے جسے عالم ناسوت یا عالم شہادت بھی کہتے ہیں۔ 2- دوسرا دائرہ کو عالم ملکوت سے تعبیر کیا گیا ہے' اسی کو عالم ارواح اور عالم غیب بھی کہتے ہیں۔ 3- تیسرا دائرہ' عالم جبروت کا دائرہ ہے۔ جسے دوسرے لفظوں میں حقیقت محمدیہ اور مرتبہ نصرت بھی کہا جاتا ہے۔ صوفیاء کے نزدیک کائنات اور اس کے علم کے دو حصے ہیں۔ ایک ظاہری' دوسرا باطنی' حلاج کے نزدیک پہلا دائرہ ظاہری دنیا ہے جس کے حقائق تک رسائی ممکن ہے دوسرا دائرہ عالم ملکوت کا ہے۔ گو وہاں تک خواص کی رسائی ہے مگر اس سے آگے کوئی نہیں جا سکتا۔ یہاں سے سالک کی بازگشت شروع ہو جاتی ہے۔ تیسرا دائرہ عالم جبروت ہے جسے حقیقت محمدیہ اور مرتبہ

احدیت کہا جاتا ہے۔ یہ صفات الٰہی کی عظمت و جلال کا مقام ہے۔ یہ مرتبہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا ہے۔ اس کو صوفیائے کرام مقام تحیر کہتے ہیں۔ چونکہ دائرے کا تصور بغیر نقطہ مرکز کے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسی واسطے حلاج نے تین نقطوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ نقطہ عروج کو فوقانی نقطہ کہا ہے اور اس سے عالم ملکوت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دوسرا نقطہ زوال ہے جسے وہ تحتانی نقطہ کہتا ہے۔ اس سے عال ناسوت مراد لیا ہے۔ تیسرا نقطہ مرتبہ احدیت ہے جو صفات الٰہی کے عظمت و جلال کا مقام ہے۔ اس کو تحیر سے تعبیر کیا ہے۔ حلاج کے مطابق ان مقامات تک پہنچنا فنائے نفس کے بغیر ناممکن ہے۔ جس طرح چار پرندے مانوس ہو کر مرنے کے بعد بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس ان کی آواز سن کر چلے جاتے ہیں اسی طرح اگر حق کے ساتھ انس پیدا کر لیا جائے اور اپنی ہستی کو فنا کر دیا جائے تو پھر اس سے جدائی ممکن نہیں ہے۔ حلاج کہتا ہے کہ سالک کے قلب پر چار وارداتیں گزرتی ہیں۔ 1- غیرت 2- غیبت 3- ہیبت 4- حیرت۔ اور یہی حقیقت کے معانی و مطالب ہیں ان سے بھی زیادہ باریک معنی ان حضرات کے اشارات ہیں جہاں مقامات روحانی کے رمز شناس ہیں اور واقف اسرار ہیں۔ اس طاسین کے آخر میں حلاج نے اس امر پر زور دیا ہے کہ یہ مقام عالم قدس کا مقام ہے اور تقدس، حرمت اس کا علم ہے۔ یہ بلند مقام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نصیب نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ آپ ہی سب سے زیادہ خدا کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔

طاسین النقطہ میں گزشتہ ابواب کی تشریح کے ساتھ ساتھ بتایا گیا ہے کہ ہر دائرے کے لئے نقطہ ایک اصل ہے جس کے بغیر کسی دائرے کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور یہ نقطہ نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے اور نہ فنا ہو سکتا ہے لہٰذا دائرے قائم رہیں گے۔ حلاج نے اس طاسین میں اس بات پر زور دیا ہے کہ ایک دنیادار جو "عالم ناسوت" میں گرفتار ہے، مجھے برا بھلا کہتا ہے۔ البتہ جو دائرہ ملکوت تک پہنچ جائے وہ میرا منکر

نہیں ہو گا اور جس پر "عالم جبروت" کے اسرار کھل جائیں، وہ مجھے ایک عالم ربانی کہے گا۔ اس سے بھی اوپر ایک عالم ہے جسے عالم لاہوت کہتے ہیں۔ اگر کسی کی رسائی وہاں تک ہو بھی جائے تو اس پر میرا مقام کھل جاتا ہے۔ وہاں وہ میرے سامنے نہیں ٹھہر سکتا مگر وہ راہ فرار اختیار کر کے کہاں جائے گا۔ کیونکہ سب کا مقر و مستقر پروردگار کی طرف سے ہے۔ قیامت میں سب وہیں ہوں گے۔ البتہ کچھ خاص بندے ایسے ہیں جنہیں یہ مقام اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔ چنانچہ سب سے زیادہ قرب خداوندی کا شرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا ہے۔ اور واقعہ معراج اس کی کھلی دلیل ہے۔ اس عظیم تقرب کے ہوتے ہوئے بھی آپ ہر لحہ اور ہر لحظہ مستقیم رہے اور مسلسل ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرتے رہے۔ چنانچہ آپ عالم نوسوت و ملکوت و جبروت سے گزر کر مقام لاہوت تک تشریف لے گئے اور جو قرب خداوندی آپ کو حاصل ہوا وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔ پھر اگر کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت کاملہ رکھتا ہو، آپ کی سنت اور طریق کا پابند ہو اور دنیا اور اس کی لذتوں اور آسائشوں سے ہاتھ اٹھا چکا ہو تو کیا بعید ہے کہ ایسے شخص کو اس دولت بیدار سے کچھ حصہ نہ ملے۔

طاسین الازل والالتباس یہ وہ کتاب ہے جو قید خانہ میں لکھی گئی اور ابن عطاء کو 309ھ میں ملی۔ اس باب کی ابتدا میں حقیقت محمدیہ کو پیش کیا گیا ہے، پھر ابلیس کا وہ تفصیلی مکالمہ درج ہے جو حق تعالیٰ اور اس کے درمیان ہوا اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام اور ابلیس کے درمیان اس مکالمے کو درج کیا گیا ہے جس کے بارہ میں حلاج کا کہنا ہے کہ ابلیس مقام ذات کا سب سے بڑا دانائے راز ہے۔ ان مکالموں کے بعد نتیجے کے طور پر حلاج نے اپنا مکالمہ و مناظرہ قلم بند کیا ہے جو اس کے اور ابلیس و فرعون کے درمیان عالم خیال میں فتوت کے بارے میں واقع ہوا۔ جس میں ابلیس نے کہا "اگر میں سجدہ کرتا تو نقطہ فتوت کا اطلاق ہرگز مجھ پر نہ ہوتا فرعون نے کہا اگر میں اس کے رسول پر ایمان لے آتا تو مرتبہ فتوت سے گر جاتا۔

اس پر حلاج نے کہا کہ اگر میں اپنے قول اور دعوے سے باز آ جاؤں تو بساط فتوت سے دور جا پڑوں گا اور یہ کیسے ممکن ہے جب کہ ابلیس و فرعون جو دونوں مردود اور ملعون ہیں اتنے ثابت قدم ہوں اور میں حق پر ہوں بلکہ حق کا ایک پر تو ہوں اپنے دعوی "انا الحق" سے دست بردار ہو جاؤں۔ اس لئے میں یہ کہوں گا کہ اولوالعزمی اور ثابت قدمی میں میرے استاد ابلیس اور فرعون ہیں۔ اس طاسین کے آخر میں نقطہ ابلیس اور اس کے نام عزازیل پر بحث کی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے اس کی اصلیت اور مرجع کیا ہے اور کیوں یہ نام اس کے لئے تجویز ہوا ہے؟

طاسین المشیت ارادہ خداوندی سے متعلق ہے اس میں پانچ دفعات ہیں ان میں ابلیس کی زبانی یہ بات بتلائی گئی ہے کہ اگر وہ پہلے دائرے سے نکل بھی جاتا تو دوسرے دائرے میں الجھ جاتا اور اگر دوسرے سے خلاصی ممکن ہوتی تو تیسرے میں گرفتار ہو جاتا۔ اس لئے ابلیس کا کردار بھی مشیت ایزدی کا ایک حصہ ہے۔

طاسینؔ التوحید کی دس دفعات میں توحید کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ اس کی تعریف اور اس کا ادراک انسانی عقل و فہم اور علم و بصیرت کی سطح پر کہیں بلند ہے۔

طاسین الاسرار فی التوحید میں گذشتہ بابوں ہی کی شرح و تفصیل ہے۔

اس باب میں 14 دفعات ہیں۔

طاسین التنزیہ میں عجز کا اعتراف کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی کسی عبادت، کسی بیان اور کسی تمثیل و تشبیہ سے تعریف و توصیف نہیں کی جا سکتی۔ ذات باری تعالیٰ ہمارے علم، فہم اور ادراک سے بلند اور منزہ ہے ہم جو بات بھی کہیں گے ادھوری ہو گی۔ جو مثال بھی سامنے لائیں گے وہ ناقص ٹھہرے گی۔

ایک فانی مخلوق ایک باقی مخلوق کی توحید بیان نہیں کر سکتی وہ یگانہ و یکتا ہماری توحید بیان کرنے کا محتاج نہیں ہے۔ وہ اس طرح ایک ہے کہ اسے کسی کے ایک ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی ذات یکتا ہماری توصیف د

تعریف اور حمد و ثنا سے بہت بلند و بالا ہے۔

آخری باب میں طاسین التنزیہ کے مضمون کو ہی مزید شرح و بسیط سے بیان کیا گیا ہے۔

متذکرہ طواسین کا اردو ترجمہ قارئین کی نذر ہے۔ بعض طواسین کا اردو ترجمہ پیچیدہ اور لغت سے ماورا الفاظ کے باعث ممکن نہیں ہو سکا ہے۔

طاسین السراج

1- غیب کے نور کا ایک چراغ تھا جو اس دنیا میں ظاہر ہوا اور پھر لوٹ آیا۔ وہ نور تمام چراغوں سے بڑھ گیا اور سب روشنیوں پر غالب آیا۔ اس کی تجلی اس طرح آشکارا ہوئی کہ تمام چاند اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ اس نور کا برج بھیدوں کے آسمان میں ہے اور وہی عظیم ستارہ ہے جس کا برج فلک حرکت ہے۔

حق تعالیٰ نے اس نور کا نام، آپ کی جمعیت خاطر کی وجہ سے امی رکھا۔ آپ ہی کو عظمت نعمت کی بنا پر باشندہ "حرم" کے لقب سے ملقب کیا اور آپ ہی کو اس تمکنت کی وجہ سے جو آپ کو قرب خداوندی سے حاصل ہے۔ مکی کے خطاب سے سرفراز فرمایا ہے۔

2- بلاشبہ حق تعالیٰ نے آپ کے سینے کو کشادہ کیا۔ آپ کے مرتبہ کو بلند کیا اور آپ کے حکم کو واجب التعظیم بنایا ہے۔ آپ کے اس بوجھ کو آپ سے اتار دیا ہے جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی۔ بالاخر آپ کی نبوت کے چاند کو ظاہر فرمایا۔ چنانچہ یمامہ کے بادلوں سے وہ چاند طلوع ہوا اور تہامہ کے علاقوں سے آفتاب بن کر چمکا اور کرامت کے کان سے آپ کے رشد و ہدایت کا چراغ جگمگایا۔

3- آپ نے جو خبر دی وہ اپنی بصیرت کی بنا پر دی ہے اور جن چھ چیزوں کا

حکم دیا ہے وہ اپنی سیرت کی سچائی پر دیا ہے۔ پہلے آپ مقام حضور پر فائز ہوئے' پھر دوسروں کو حاضر فرمایا۔ اول معاملہ حق واضح کیا۔ پھر آگاہی دی۔ پہلے آپ نے راستہ بتایا' پھر قصد فرمایا۔

4- حقیقت میں آپ کو سوائے صدیق اکبرؓ کے کسی اور نے نہیں دیکھا ہے' کیونکہ انہوں نے آپ کے ساتھ موافقت کی۔ پھر آپ کا ساتھ دیا ہے۔ یقیناً ان دونوں کے درمیان جدائی کرنے والا کوئی باقی نہ تھا۔

5- آپ کو کسی عارف نے نہیں پہچانا ہے' کیونکہ آپ کا وصف ہمیشہ اس پر نامعلوم ہی رہا ہے اور وہ آپ کی صفت کما حقہ معلوم نہیں کر سکتا ہے۔ حق تعالیٰ خود آپ کے اوصاف کے انکشاف کا ذمہ دار ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جنہیں ہم نے کتاب دی وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور ان میں سے ایک فریق ایسا ہے جو دانستہ حق کو چھپاتا ہے حالانکہ وہ جانتے ہیں۔

6- نبوت کے انوار آپ ہی کے نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کی تمام روشنیاں آپ ہی کی روشنی سے ظاہر ہوئی ہیں۔ روشنیوں میں سے کوئی روشنی سے زیادہ تابناک' زیادہ واضح اور زیادہ قدیم نہیں ہے۔

7- آپ کی ہمت تمام ہمتوں پر سبقت لے گئی ہے۔ آپ کا وجود عدم پر سبقت لے گیا ہے۔ اور آپ کا اسم مبارک قلم تقدیر پر بھی سبقت لے گیا ہے۔ کیونکہ آپ ہی ہیں جو جن و انس کی تمام امتوں سے پہلے تھے۔ کوئی بھی اس عالم میں ہو یا اس عالم کے علاوہ ہو یا اس عالم سے ماورا ہو۔ وہ آپ سے زیادہ متصف و مہربان' ڈرنے والا اور رحم دل نہیں ہے۔ آپ صاحب معراج اکبر ہیں اور مخلوق کے سردار ہیں آپ کا اسم گرامی احمد اور آپ کی تعریف یگانہ و یکتا ہے۔ آپ کا حکم اٹل' آپ کی ذات غنی' آپ کی صفت بلند اور آپ کی ہمت منفرد ہے۔

8- سبحان اللہ حق تعالیٰ نے کیا خوب آپ کو غالب فرمایا ہے اور کیا عمدہ وقار آپ کو بخشا ہے۔ کیسی عظمت و شہرت آپ کو عطا فرمائی ہے اور کس درجہ منور' قادر اور دیدہ ور بنایا۔

آپ ہمیشہ رہے' بلکہ مخلوقات و موجودات سے پہلے بھی آپ کا ذکر خیر تھا۔ آپ کے تذکرہ کا سلسلہ ازل سے اور ابد تک جاری رہے گا۔ آپ جواہر مجردہ اور عالم ارواح سے پہلے اور ان کے بعد بھی ہیں۔ آپ کا جوہر صفائی والا' آپ کا کلام خیر دینے والا اور آپ کا علم بلندی والا ہے۔ آپ کی زبان عربی' آپ کا قبیلہ نہ مشرقی ہے اور نہ مغربی ہے۔ آپ کی جنس فعالیت کا مظہر ہے۔ آپ کا معاملہ اور برتاؤ اصلاح خلق ہے۔

9- آپ کے اشارے سے آنکھیں روشن ہو گئی ہیں۔ آپ ہی کے ذریعہ سے بھید اور پوشیدہ چیزیں پہچانی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کلام آپ کی زبان پر جاری کیا۔ یعنی آپ کا کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ خود دلیل نے آپ کی صداقت پر مہر ثبت کی ہے بلکہ آپ کی ذات خود ہی دلیل اور خود ہی مدلول ہے۔ آپ ہی نے سینہ سوزاں سے زنگ کدروت کو دور فرمایا ہے۔ آپ کوئی ایجاد کیا ہوا' گھڑا ہوا' اور کسی کی طرف سے بنایا ہوا نہیں بلکہ قدیم کلام لے کر آئے ہیں۔ آپ حق کے ساتھ بغیر کسی جدائی کے وابستہ ہیں اور آپ کے کمال کا ادراک معقولات کی حد سے خارج ہے' آپ کے علاوہ کسی نے بھی نہایتوں کی نہایت اور غایتوں کی غایت کی خبر نہیں دی ہے۔

10- آپ نے شک و شبہ کے بادل کو اٹھا دیا ہے اور بیت الحرام کی کھلی فضا کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپ کمال و عظمت والے ہیں۔ آپ ہی کو بتوں کے توڑنے کا حکم دیا گیا ہے اور آپ ہی کو مخلوقات اور کل اجسام کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔

11- آپ کے سر کے اوپر ایک نور کا بادل تھا' جو چمکا اسی طرح آپ کے قدموں کے نیچے بھی ایک نور کی تجلی تھی جس نے دنیا کو جگمگایا۔ اس تجلی کی روشنی چاروں طرف پھیلی اور بادل کا پانی بھی چاروں طرف برسا اور پھل لایا۔ تمام علوم آپ کے بحر علم کا ایک قطرہ ہیں۔ اس طرح حکمتیں آپ کے معارف کے سمندر کی ایک چلو ہیں اور تمام زمانے آپ کے وقت کی ایک ساعت ہیں۔

12- حق آپ کے ساتھ ہے اور حقیقت بھی آپ کے ساتھ ہے۔ سچائی اور نرمی آپ کی ذات کا جوہر ہے۔ آپ قرب میں سب سے پہلے اور نبوت میں سب سے بعد ہیں ازروئے حقیقت آپ باطن ہیں اور ازروئے معرفت آپ ظاہر ہیں۔

13- کوئی عالم آپ کے علم تک نہیں پہنچ سکا اور نہ کوئی فیصلہ کرنے والا آپ کی فہم و بصیرت پر اطلاع حاصل کر سکا ہے۔

14- حق تعالیٰ نے آپ کو مخلوق میں سے کسی کے سپرد نہیں کیا کیونکہ آپ مقام "ہو" کے رمزشناس ہیں اور وہ مقام "ہو" اور ذات مطلق کہاں ہے؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے کیونکہ وہ جہاں اور جیسا ہے' وہ ہے۔

15- کوئی بھی باہر نکلنے والا "محمد" کے میم سے باہر نہیں نکلا۔ اور کوئی بھی داخل ہونے والا "محمد" کی حاء میں داخل نہیں ہو پایا۔ لفظ "محمد" کی حاء دوسرا میم اور اس کی دال پہلا میم ہے۔ اس نقطہ کی دال آپ کی ہمیشگی پر دلالت کرتی ہے۔ اس کا میم آپ کے مقام کی بلندی کی خبر دیتا ہے اور اس کی حاء آپ کے حال کا مظہر ہے۔

16- اللہ تعالیٰ نے آپ کے قول کو ظاہر کیا ہے۔ آپ کی خبر کو نمودار کیا ہے اور آپ کی دلیل کو پھیلایا ہے۔ اسی نے قرآن کو نازل کیا ہے۔ اسی

نے آپ کی زبان کو روانی بخشی ہے اور اسی نے آپ کے قلب مبارک کو منور فرمایا ہے۔ وہی ذات ہے جس نے آپ کی بنیاد کو ثابت اور سچا کر دکھایا ہے اور جس نے آپ کی شان کو تمام دنیا پر ارفع و اعلیٰ کیا ہے۔

17- اے راہ حق کے طلب گار! اگر تو آپؐ کے بتلائے ہوئے راستوں سے بھاگے گا تو پھر تیرے لئے کون سا نجات کا راستہ رہ جاتا ہے۔

اے بیمار! اس راہ میں تجھے کوئی رہنما نہیں ملے گا۔ سچائی کی راہ اس کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

دیکھ! تمام دانا لوگوں کی حکمتیں آپ کی حکمت و دانائی کے سامنے ریت کے بھر بھرے ٹیلوں کی طرح ہیں۔

طاسین الفہم

1- مخلوقات کی سمجھ اور سوچ کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے اسی طرح حقیقت ایک ایسی چیز ہے جس کا مخلوق سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ دل میں گزرنے والے خیالات دراصل ہر شخص کے اپنے اوہام و افکار ہوتے ہیں جو کبھی بھی حقائق کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حقیقت کے علم تک رسائی بڑی دشوار ہے۔ پس حقیقت کی تہہ تک کیسے پہنچ ہو۔ اسی کو عرفا حقیقۃ الحقیقہ کہتے ہیں۔ جہاں تک حق کا تعلق ہے وہ حقیقت کے درجے سے بلند ہے۔ اسی واسطے حقیقت کو حق نہیں سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ وہ اس سے علیحدہ ایک چیز ہے۔

2- پروانہ صبح تک چراغ کے چاروں طرف چکر لگاتا ہے۔ پھر مختلف شکلوں میں لوٹ کر آتا ہے اور اپنے اصل حال کی لطیف ترین گفتگو کے ذریعے خبر دیتا ہے۔ وہ اس عالم میں بڑے ناز و مسرت کے ساتھ خوش رہتا ہے۔ کیونکہ کمال تک پہنچنے کی امید اس کے سینے میں ہوتی ہے۔

3- چراغ کی روشنی حقیقت کا علم ہے۔ اس کی گرمی حقیقت کی تہہ اور اس تک رسائی حقیقت کا حق ہوتا ہے۔

4- چراغ کی روشنی اور اس کی گرمی پر راضی نہیں ہوا۔ اس لئے اس نے پورے طور پر اپنے آپ کو آگ میں ڈال دیا۔ بعدازاں مختلف شکلیں اس کی آمد کا انتظار کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ ان کو مقام نظر کے بارے میں خبردیتا ہے اور نظر کو خبر پر ترجیح دیتا ہے جب وہ اس درجہ کو پہنچتا ہے تو لاشہ ہو جاتا ہے اور حقیر و پست بن کر بکھر جاتا ہے' اب وہ بغیر کسی علامت کے' بغیر کسی جسم کے' بغیر کسی نام اور بغیر کسی نشان کے باقی رہتا ہے۔

جانتے ہو کس معنی کی خاطر وہ مختلف صورتوں کی طرف لوٹتا ہے اور کس حال کے لئے جب کہ وہ یہ درجہ پا لیتا ہے۔ ایسا ہو جاتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جو مقام نظر تک پہنچ جاتا ہے وہ خبر کے عالم سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور جس کی رسائی منظور تک ہو جاتی ہے وہ مقام نظر کی بھی پروا نہیں کرتا۔

5- یہ بات ایک کم ہمت' ست' مٹنے والے' پاپ کے پتلے اور خواہشات کے پجاری پر پوری نہیں اتر سکتی ہے۔ میری طرح' ہاں! میری طرح۔ گویا کہ میں "وہ" ہوں یا "وہ" ہو گیا۔ اگر تو "میں" بن گیا تو مجھ سے اجتناب نہ کر۔ بالفاظ دیگر میں اس کی طرح ہوں اور وہ میری طرح ہے تو وہ مجھے خود اپنے ہی سے خوفزدہ نہیں کرے گا۔

6- اے گمان کرنے والے! ایسا گمان نہ کر "اب" میں ہوں یا "آئندہ" میں ہوں گا یا "کبھی" میں تھا۔ البتہ تو صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ایک مستعد عارف ہوں یا پھر تو یہ کہہ سکتا ہے کہ میرا ایک حال ہے جو نامکمل ہے۔ اس کا تو ہو سکتا ہوں لیکن میں "وہ" نہیں ہو سکتا ہوں۔

اے نفس اگر تو سمجھنا چاہتا ہے تو یہ سمجھ لے کہ حقیقت سوائے احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور کے سپرد نہیں کی گئی۔ جن کی شان میں یہ آیت ہے **واکانۂ وحعذ ابا احذ محمد** (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول اور سب نبیوں کے آخر میں ہیں۔ جب آپ دو جہاں کی حدود سے آگے بڑھ گئے' مقام جن و انس سے اوجھل ہو گئے اور آپ نے عالم امکان سے آنکھ بند کر لی تو پھر آپ کے لئے کسی جھوٹ اور غلطی کا شائبہ باقی نہیں رہا۔

یہاں تک کہ آپ **فکان قاب قوسین** کے درجہ قرب تک پہنچ گئے یعنی آپ اتنے قریب ہوئے کہ دو کمانوں کا یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔

جب آپ حقیقت کے علم کی منزل تک پہنچے تو آپ نے قلب کے بارے میں بر دی اور اسی کو پرکھا اور جب حقیقت کے حق ہونے پر آگاہ ہوئے تو اس وقت ی مراد ترک کر دی اور خدائے بخشندہ کی اطاعت کے لئے سر تسلیم خم فرما دیا۔ اور د کو حق کے سپرد کر دیا اور جب حق تک پہنچے تو وہاں سے رجوع کیا بالآخر آپ کو ال حق نصیب ہوا اور آپ واپس تشریف لے آئے۔ اس وقت آپ نے فرمایا۔ ے اللہ! میری روح نے تجھے سجدہ کیا اور میرا دل تجھ پر ایمان لایا۔

جب آپ غایتوں کی غایت تک پہنچے تو فرمایا: اے اللہ! ایسی تعریف جو تیرے ے سزاوار ہے' میں اس کا احاطہ نہیں کر سکتا ہوں۔ اور جب آپ کی رسائی قت کی حقیقت تک ہوئی تو ارشاد فرمایا: اے اللہ! تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے اپنا وصف بیان کیا ہے۔

آپ نے خواہش نفس سے منہ پھیر لیا اور اپنی مراد تک پہنچ گئے۔ سدرۃ نتہیٰ کے پاس نہ آپ داہنی جانب حقیقت کی طرف متوجہ ہوئے اور نہ بائیں ب' حقیقت کی حقیقت کی طرف ملتفت ہوئے۔ بلکہ مستقیم رہے۔

طاسین الصفا

1- حقیقت ایک باریک چیز ہے۔ اس کے راستے تنگ ہیں۔ اس میں اونچی اٹھی ہوئی آگیں ہیں اور اس کے پرے گہرا بیاباں ہے۔ ایک اجنبی یعنی سالک اس راستہ پر چلتا ہے اور چالیس مقامات طے کرنے کی خبر دیتا ہے۔

وہ مقامات یہ ہیں۔

1- ادب 2- ذہب 3- سبب 4- طلب 5- عجب 6- عطب 7- طرب 8- شرہ 9- نزہ صفا 10- صدق 11- رفق 12- عتق 13- تسویح (تصریح) 14- ترویح 15- تمانی 16- شہود 17- وجود 18- عد 19- کد 20- رد 21- امتداد 22- اعتداد 23- انفراد 24- انقیاد 25- مراد 26- حضور 27- ریاضت 28- حیاطت 29- افتقار 30- اصطلاد 31- تدبر 32- تحیر 33- تفکر 34- تصبر 35- تغیر 36 رفض 37- تنقص 38- رعایت 39- ہدایت اور 40- بدائت۔

یہ اہل صفا اور صفوت کا مقام ہے۔

2- ان میں سے ہر مقام کے کچھ علوم ہیں۔ کچھ سمجھ میں آتے ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتے ہیں۔

3- آخر کار سالک بیابان میں داخل ہوتا ہے اور وہاں جاگزیں ہوتا ہے اور پھر وہاں سے گزر جاتا ہے۔ اس بیاباں میں چاہے پہاڑ ہو یا ہموار زمین، کسی اہل کے لئے آرام و آہستگی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔

4- پس جو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی مدت پوری کر دی۔ تو انہوں نے اپنے اہل و عیال کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ اس وقت حقیقت کے سزاوار ہوگئے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ مقام "نظر" کے مقابلے میں مقام خبر" پر راضی ہو گئے تھے تاکہ چھوٹے بڑے کے درمیان فرق برقرار رہے۔ اسی واسطے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا "شاید میں تمہارے پاس وہاں سے کچھ خبر لاؤں۔"

5- جب ہدایت پانے والا "خبر" پر راضی ہو جاتا ہے تو ایک پیروی کرنے والا کیوں اس کے نقش قدم پر راضی نہ ہو۔

6- موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ سنا وہ کوہ طور پر درخت سے نہیں سنا اور نہ اس درخت کے قرب و جوار سے سنا ہے۔ بلکہ حق تعالیٰ سے سنا ہے۔

7- میری مثال اس درخت جیسی ہے یہ اس کا کلام ہے۔ گویا میرا کلام نہیں ہے۔

8- پس وہ حقیقت جو تمہارے ذہن کی پیداوار ہے وہ بھی مخلوق ہے۔ لہٰذا تو مخلوق کو چھوڑ دے تاکہ تو "وہ" یا وہ "تو" ہو جائے۔

9- کیونکہ میں تو صرف اس کا وصف بیان کرنے والا ہوں۔ میرا کچھ نہیں ہے اس لئے حقیقت میں موصوف ہی ہے جو مختلف پردوں میں اپنا وصف بیان کر رہا ہے۔ پس کیا شان ہے اس موصوف حقیقی کی۔

10- حق نے اس سے کہا کہ تو دلیل کے لئے راہ نما ہے مگر مدلول کے لئے نہیں اور میں دلیل کے لئے بھی دلیل ہوں۔

11- حق نے مجھے عہد' قول اور اقرار کی مضبوطی سے وہ بتا دیا ہے جو حقیقت ہے اس کی شہادت میرے بھید نے میرے ضمیر کے بغیر دی ہے۔ یہی میرا بھید ہے اور یہ طریقت سے بلند ہے۔ اس کی جانب این و آن سے اشارہ کیا جا سکتا ہے وہی عارفوں کے نزدیک حقیقت ہے۔

12- حق نے میرے دل اور میرے علم کے بارے میں میری زبان میں بات کی ہے۔ اس نے دوری کے بعد مجھے اپنا قرب عطا کیا ہے اور اپنا برگزیدہ اور خاص بندہ بنایا۔

طاسین الدائرہ
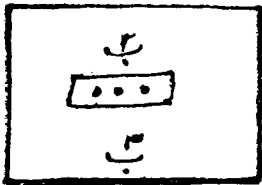
1- برائی وہ پہلا دائرہ ہے جس تک سالک پہنچ سکتا ہے۔ دوسرا دائرہ ای
ہے کہ وہاں سالک پہنچ تو جاتا ہے لیکن پھر وہاں سے منقطع ہو جاتا ہے او
تیسرا دائرہ حقیقتہ الحقیقہ کے بیابانوں کا دائرہ ہے کہ وہاں سر گشتگی اور تح
کے سوا کچھ نہیں ہے۔ سالک وہاں بھٹک جاتا ہے اور گم ہو جاتا ہے۔ ب
سے مراد باب ہے۔

پہلے دائرہ سے وہ دائرہ مراد ہے جس کے سرے پر ب اس طرح واقع
کہ اس میں داخل ہونے کی واضح گنجائش پائی جاتی ہے۔ گویا پہلے دائر
کا دروازہ موجود ہے۔ ب 2 کو دوسرا دروازہ کہنا چاہیئے جو دائرے
کنارے پر نہیں بلکہ اندر واقع ہے۔ یہاں تک سالک پہنچ تو سکتا ہے
یہاں سے پھر منقطع ہو جاتا ہے اور اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ ب 3 حق
الحقیقہ کے بیابانوں کا دروازہ ہے۔ یہ وہ باب یعنی ب 3 ہے جو ب 2
محاذ میں دوسرے دائرے کے نیچے واقع ہے۔

حاصل کلام یہ نکلا کہ پہلے عالم تک رسائی ہے۔ دوسرے عالم تک ا
رسائی نہ ہے لیکن وہاں سے سالک کی واپسی شروع ہو جاتی ہے
تیسرے عالم تک اس کے شعور و عقل کی رسائی نہیں وہاں تحیر، سر
ہے۔

2- اور افسوس ہے اس شخص پر جو دائرے میں داخل ہو جائے اور
بڑھنا چاہے تو اس پر راستہ بند کر دیا جائے۔ یہ وہ مقام ہے کہ طا
یہاں سے لوٹا دیا جاتا ہے۔

دائرے میں اوپر کا نقطہ طالب کی قسمت نیچے کا نقطہ اپنی اصل کی
سالک کی بازگشت ہے۔ درمیانی نقطہ سالک کی سر گشتگی اور اس
ہے۔

3- اور وہ دائرہ جس کا کوئی دروازہ نظر نہیں آتا ہے۔ اس ک

درمیان جو نقطہ ہے وہی حقیقت ہے۔ یہی وہ مختصر دائرہ ہے کہ جو دائرہ
ثانی کے درمیان واقع ہے۔

4- حقیقت کے معنی ایک ایسی چیز یا کیفیت و حیرت ہے جس سے نہ عالم
ظاہری اور نہ عالم باطنی کی اشیاء چھپی رہتی ہیں اور یہ حقیقت اشکال بھی
قبول نہیں کرتی ہے گویا جو ہر لطیف ہے۔

5- اگر تو اس چیز کو سمجھنا چاہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے تو "
چار پرندے لے اور ان کو مانوس کر لے۔" کیونکہ جو حق ہے وہ
تیرے پاس سے اڑ کر نہیں جائے گا۔

6- غیرت حقیقت کو غیبت کے بعد حاضر کر دیتی ہے۔ ہیبت اس کو روک
دیتی ہے اور حیرت اس کو چھین لیتی ہے۔

7- یہ حقیقت کے معانی اور مطالب ہیں۔ اس سے بھی زیادہ باریک چیز
ان مرکزوں تک رسائی رکھنے والے حضرات کا نقل کردہ کلام ہے۔

8- سالک یہ سب کچھ دائرے کے اطراف سے دیکھتا ہے دائرے کے
پرے سے کچھ نہیں دیکھتا ہے۔

9- جہاں تک علم الحقیقت کے سمجھنے کا تعلق ہے۔ وہ فی نفسہ مقدس ہے
اور یہ ہی دائرہ اس کا تقدس ہے۔ علم کیا ہے؟ طلب ہے اور دائرہ تقدس
ہے۔

10- اسی واسطے حق تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو "حرمی" یعنی
حرمت و تقدس والا کہا ہے۔ کیونکہ آپ کسی وقت بھی دائرہ حرمت و
تقدس سے باہر نہیں نکلے ہیں۔

11- آپ کی ذات مخلوقات سے ماورا ہے۔ آپ خدا سے ڈرنے والے
اور مخلوقات پر نرم دل ہیں۔ آپ نے ان پر اظہار افسوس کیا ہے۔
کیونکہ وہ حقیقت سے غافل ہیں۔

طاسین النقطہ

1- اور اس سے بھی زیادہ دقیق بیان نقطہ کا ذکر ہے جو "اصل" ہے اور جو نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے اور نہ فنا ہوتا ہے۔ گویا وہ ہمیشہ ایک حالت پر رہتا ہے۔

2- میرا منکر وہ شخص ہے جو دائرہ برائی تک محدود ہے۔ چونکہ اس نے مجھے ظاہری دنیا کے دائرے سے بلند ہو کر نہیں دیکھا۔ اس نے مجھے زندقہ و الحاد سے منسوب کیا اور مجھ پر برائی کا تیر چلایا ہے۔ وہ اس وقت فریاد کرے گا جب میرا تیر اس دائرہ قدس میں دیکھے گا جو اس مادی دنیا سے کہیں بلند و ارفع ہے۔

3- اور وہ شخص جس کی رسائی دوسرے دائرے یعنی عالم ملکوت تک ہے، مجھے ایک عالم ربانی تصور کرتا ہے۔

4- اور جو شخص تیسرے دائرے تک پہنچ گیا، اس نے یہ خیال کیا کہ میں اپنے مقاصد میں خوش ہوں۔

5- اور وہ شخص جس کو دائرہ حقیقت تک پہنچنے میں کامیابی ہو جائے وہ مجھے بھول جاتا ہے اور میری نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔

6- ہرگز نہیں! بھاگ کر کہیں پناہ کی جگہ نہیں ہے۔ اس دن تیرے رب کی طرف سے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ اس دن آدمی کو بتلا دیا جائے گا جو اس کے آگے بھیجا ہے اور جو پیچھے چھوڑا ہے۔

7- خبر کی طرف دوڑا ہے۔ جائے پناہ کی طرف بھاگا ہے، چنگاری سے ڈرا ہے، دھوکہ کھایا ہے اور اپنے نفس کو ہلاک کیا ہے۔

8- میں نے تصوف کے پرندوں میں سے ایک پرندہ دیکھا جس کے دو بازو تھے وہ ان کے ذریعے اڑ رہا تھا۔ جب اس میں اڑنے کی سکت نہ رہی تو

اس نے میرے حال سے انکار کر دیا۔

9- اس نے مجھ سے مقام صفا کے بارے میں سوال کیا، میں نے اس سے کہا کہ فنا کی قینچی سے اپنے بازو کاٹ ڈال، ورنہ تو میری پیروی نہیں کر سکے گا۔

10- اس پر مرغ تصوف نے کہا کہ میں بازوؤں کے ذریعے اڑ کر اپنے دوست کے پاس جاتا ہوں۔ میں نے کہا "افسوس ہے تجھ پر" اے اڑنے والے! اس کی مانند کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ سننے والا ہے اور دیکھنے والا ہے۔

12- اور دائرے میں فہم کی صورت یہ ہے۔

میں نے اپنے پروردگار کو اپنے دل کی آنکھ سے دیکھا تو کہا تو کون ہے۔ جواب دیا "تو" اے پروردگار تیرے بارے میں "کہاں" کو یہ مجال نہیں ہے کہ وہ دم مارے بلکہ جس جگہ تو ہے وہاں اس کا گزر بھی نہیں ہے۔ زمانے کی یہ مجال نہیں ہے کہ جہاں تو ہے وہاں اس کے گمان کی پرچھائیں پڑ سکے یا وہ جانے کہ تو کہاں ہے؟

تو وہ ہے جس نے 'کہاں' اور 'کب' کو جس رنگ میں بھی ہو اس طرح دھکیل دیا ہے کہ اب اس کا وجود باقی نہیں رہا ہے۔ پس تو کہاں ہے؟ یہ کون کہہ سکتا ہے۔

12- فہم کی صورت یہ ہے کہ اس کا بھی ایک دائرہ ہے۔ اس دائرہ افکار کا نقطہ اول فہم ہے۔ افکار میں سے ایک قسم حق ہے اور دوسرے باطل۔

13- آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قلب پر رات گزار دی۔ آپ نے اپنے نفس سے دوری اختیار کی اور اپنے رب کے قریب ہو گئے۔

اور آپ اپنے اوصاف و صفات کی بنا پر عالم قدس کے نزدیک

ہوئے اور اپنی ذات عالی کی وجہ سے قرب خداوندی کے مستحق ہو گئے۔ دنیٰ اور تدلیٰ دونوں کے معنی قریب ہونے کے ہیں۔ یہ دونوں لفظ سورہ نجم 8:53 میں آئے ہیں دنیٰ سے قرب اور تدلیٰ سے تقرب خاص مراد ہے۔ دنیٰ آپ کے اوصاف کی بلندی اور تدلیٰ آپ کی رفعت ذاتی پر دلالت کرتا ہے۔ سمو سے بلندی صفات اور علوا سے بلندی ذات مطلوب ہے۔ اس طرح دنیٰ مقام طلب کو ظاہر کرتا ہے اور تدلیٰ مقام شوق کو، یعنی جب آپ نزدیک ہوئے تو طلب کے جذبے سے ہوئے اور جب مزید قریب ہوئے تو شوق کی کیفیت سے ہوئے۔ آپ دنیا و مافیہا سے غائب ہوئے تو مرتبہ رویت میں داخل ہوئے اور مقام حضور حاصل کیا۔ اس لئے آپ کو پوشیدہ و غائب نہیں کہا جا سکتا۔ آپ کو درجہ حضور ملا جیسا کہ آپ کا درجہ حضور ہے۔ اور آپ نے دیکھا' جیسا کہ آپ نے دیکھا۔

14- آپ نے عالم ملک سے کنارہ کشی اختیار کی پھر حقائق و معارف کو دیکھا۔ جب ذات جمال الٰہی کو دیکھا تو آپ متحیر ہوئے یعنی مقام تحیر پر فائز ہوئے۔ آپ پر تجلیات و صفات الٰہی کا غلبہ ہوا' پہلے آپ کو مقام حضور عطا کیا گیا۔ پھر آپ نے تجلی ذات کا مشاہدہ کیا' آپ کو قرب اور وصل نصیب ہوا۔ پھر آپ جدا ہوئے۔ یعنی اپنی مراد سے وابستہ ہو گئے اور اپنے دل سے الگ ہو گئے۔ اس عالم میں "جو کچھ آپ نے دیکھا" آپ عالم ناسوت سے اوجھل کیا پھر عالم ملکوت کا قرب بخشا۔ آپ کو ولایت کا رتبہ دیا۔ پھر محبت کا خاص مقام عطا کیا۔ آپ کو نعمتوں سے سیراب کیا۔ پھر روحانی تربیت فرمائی۔ آپ کو پاک و صاف کیا پھر برگزیدہ بنایا۔ آپ کو بلایا پھر مجلس قدس کا جلیس بنایا۔ آپ کو آزمایا پھر شفاء فرمائی۔ آپ کو محفوظ کیا پھر مرکب پر سوار فرمایا۔

16- جب آپ نے رجوع کیا اور آپ کو ادراک حاصل ہو گیا تو آپ " قاب" کے مصداق ہو گئے اور جب آپ کو بلایا گیا تو آپ نے جواب دیا۔

آپ نے تجلیات ربانی کو دیکھا تو اس مادی دنیا سے پوشیدہ ہو گئے۔ اپنے معرفت و علامت کی لذت و چاشنی کے شیریں جرعات نوش کئے اور آپ اس سے روحانی طور پر مسرور و شاداں ہوئے۔ آپ کو قرب خداوندی حاصل ہوا اور جلال الٰہی سے آپ پر ہیبت طاری ہوئی۔ آپ نے اپنے علاقے' اپنے دوستوں' اپنے اسرار' اپنی معلومات اور تمام آثار بشریہ سے مفارقت اختیار کر لی۔

17- "تمہارے ساتھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں بھٹکے۔"

آپ کے بارے میں نہ بیماری کا گمان کیا جا سکتا ہے اور نہ ملال کا۔ یعنی آپ معراج کے موقعہ پر نہ بیمار ہوئے اور نہ افسردہ' نہ آپ کی چشم مبارک "این" (کہاں کب) سے بیمار ہوئی اور نہ آپ کے وقت پر افسردگی کی پرچھائیں پڑیں۔

18- ہمارے معاملات و متعلقات میں "تمہارے ساتھی نہیں بھٹکے" ہمارے مشاہدے کے وقت ذکر کے "باغ" میں تمہارے ساتھی نہیں بھٹکے اور فکری گردش میں بے راہ نہیں چلے۔

19- اس کے برعکس وہ ہر گھڑی اور ہر لمحہ حق تعالیٰ کے لئے ذاکر رہے اور اس کی طرف سے انعامات ہوں یا تکالیف' دونوں پر بہرصورت شاکر رہے۔

20- یہ نہیں ہے مگر وہ وحی جو آپ کی طرف بھیجی گئی ہے۔ ایک نور سے دوسرے نور تک سلسلہ ہے۔

21- آپ نے کلام کو بدل دیا' یعنی اس کو حقائق کا رتبہ دیا اور اوہام کی

دنیا سے اوجھل ہو گئے۔ مخلوقات اور لوگوں سے بلند ہو گئے اور ان سے نظم و ضبط منقطع کر دیا۔

اے سالک، تو بھی سرگشتہ حیرت زدہ عشاق کی جماعت میں شامل ہو جا اور امور باطن پر دیدہ ور ہو جا، تاکہ تو بھی عالم بالا کے پہاڑوں اور وہاں کی گھاٹیوں کا پرندا بن جائے۔ ایسے پہاڑ جو فہم کے ہیں اور ایسی گھاٹیاں جو سلامتی کی ہیں۔ پھر تو وہ دیکھے جو تجھے دیکھنا ہے اور تو حرمت والی مسجد سے روزے کی ایک تیز تلوار ہو جائے۔

22- اس کے بعد آپ اس طرح قریب ہوئے جس کو معنوی قرب کہتے ہیں پھر آپ ایک تیر چلنے والے کی طرح رکے۔ ایک بے بس کی مانند نہیں رکے۔ پھر تادیب کے مقام سے تقریب کے مقام تک پہنچے اور تاریب کے مقام سے تقریب کے مقام تک تشریف لے گئے۔

چنانچہ آپ طالب کی حیثیت سے قریب ہوئے اور مشتاق کی حیثیت سے مقرب ہوئے۔ ایک داعی کی حیثیت سے قریب ہوئے اور ہم نشین کی حیثیت کی حیثیت سے مقرب ہوئے۔ ایک جواب دینے والے کی حیثیت سے قریب ہوئے اور قرب خاص کی وجہ سے مقرب ہوئے اور شہید و گواہ کی حیثیت سے قریب ہوئے اور ایک صاحب مشاہدہ کی حیثیت سے مقرب ہوئے۔

23- پھر آپ قاب قوسین کا مصداق ہو گئے آپ نے این حرف استفہام (کہاں، کب) کو بین (جدائی) کے تیر سے پھینک دیا۔ قوسین کو ثابت کر دیا تاکہ این (کہاں) کے مفہوم کی صحت کو قائم کیا جا سکے۔ چنانچہ آپ حق کی خاطر مخلوق سے پوشیدہ ہو کر حقیقۃ الحقیقہ کے اور بھی قریب ہو گئے۔

24- ترجمہ ممکن نہیں ہے۔

25- میں ہرگز یہ گمان نہیں کرتا ہوں کہ ہمارے کلام کو سوائے اس

شخص کے جو قوس ثانی تک پہنچا ہے، کوئی اور سمجھ سکے اور قوس ثانی، لوح کے علاوہ ہے۔

26- اور اس کے کچھ حروف ہیں جو عربی حروف سے جدا ہیں۔ یعنی یہ ایسے حروف ہیں جن کو نہ عربی کہا جا سکتا ہے نہ عجمی۔

27- صرف ایک حرف ایسا ہے جو میم ہے۔

28- یہی میم ہے جو آخری اسم ہے۔

29- اسی کو "قوس اول" کی زہ سمجھنا چاہئے۔

30- ترجمہ ممکن نہیں ہے۔

31- کلام کی خوبی مقام قرب کے معنی کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ پس وہی معنی عمدہ اور بہترین ہوں گے جو حق کی حقیقت کے لئے شایان شان ہوں۔ مخلوق کے طور طریقوں کے لئے نہ ہوں اور مقام قریب نگہداشت کی ایک دنیا ہے۔

32- حقائق یعنی عالمگیر اصول کا سچا ثابت ہونا ہی حقیقت ہے۔ خواہ وہ اصول کتنے ہی باریک کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ دقیق سے دقیق معنی کا کھولنا حقیقت ہے۔ یہ بات سابقہ زمانوں کے مشاہدے کی شناخت اور بلند تجربات سے پیدا ہوئی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک آرزو مند اور طالب تریاق جیسا وصف رکھتا ہو۔ اس حقائق کی تلخیوں کی کاٹ وہی تریاق کر سکتا ہے، وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ سالک دنیاوی تعلقات کو اپنی نظروں کے سامنے توڑ دے۔ حوادث و مصائب کے بستروں پر لوٹے اور سختیوں اور تکلیفوں کے سلسلہ کو جاری رکھے۔ ان باریکیوں کو کھول کر بیان کرنے کے لئے کھری اور مبنی برخلوص بات کی ضرورت ہے۔ جو عام راستوں سے ہٹ کر خاص طریق سے لوگوں کی حیثیت کو سامنے رکھ کر بیان کی گئی ہو۔

اور قرب سے مراد ایسا مقام ہے جو اپنے معنی میں وسیع مگر پوشیدہ مفہوم رکھتا ہے۔ جسے ایک معنی پرست ہی سمجھ سکتا ہے۔ ایسا معنوی جو اپنے آپ کو جہالت و نادانی کے بیان سے نکالنے والا اور حقائق کے آب شیریں سے سیراب کرنے والا ہو اور جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کاملہ ہو۔

-33 ایسے ہی شخص کے بارے میں تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ معاصی سے پاک اور رذائل سے بے عیب ہوتا ہے۔ پوشیدہ کتاب میں جسے لوح اور علم الٰہی کہتے ہیں وہ محفوظ و مامون ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنی لکھی ہوئی کتاب میں (سورہ طور' 52 : 2) بیان کیا ہے۔ ایسا ہی شخص پرندوں کی بولیوں کے مفہوم پر بھی مطلع ہوتا ہے۔ اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کو ہم نے **فکان قاب قوسین** یعنی انتہائی قرب کے درجے تک پہنچایا ہے جو مقام عینیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تاکہ وہ اس کو مطمع نظر بنائے۔

-34 اے مشتاق : اگر تو واقعی سمجھنا چاہتا ہے تو سمجھ کہ آقا' اھل (سزاوار شخص) کے علاوہ کسی اور سے خطاب نہیں کرتا ہے اور کسی اہل کے ذریعے ہی کسی اہل سے خطاب کرتا ہے یا اس اہل سے متعلق کوئی شخص ہو اس سے کلام کرتا ہے۔

-35 ایسے شخص کا نہ کوئی استاد ہوتا ہے نہ شاگرد' اس کے پاس کوئی اختیار ہوتا ہے نہ تمیز کی کوئی طاقت ہوتی ہے۔ کسی سے کوئی بات چھپاتا ہے' نہ کسی کو آگاہ کرتا ہے' نہ اس کے ذریعے سے کوئی چیز ہوتی ہے نہ اس کی طرف کوئی بات ہوتی ہے۔ بلکہ جو کچھ ہے اسی میں ہے۔ "وہ" ہی اس میں ہے اور اس میں کچھ نہیں ہے۔ بیابان' در بیابان اور آیت در آیت کی شان اسی میں ہے۔

-36 اقوال اس کے معانی اور معانی اس کے مقاصد ہیں۔ اس کا مقصد دور ہے' اس کا راستہ سخت ہے۔ اس کا نام بزرگ ہے۔ اس کا نشان یکتا ہے۔ اس کی شناخت اس کا عام ہونا ہے اور اس کا عام ہونا ہی اس کی حقیقت ہے۔ اس کی قدر و منزلت اس کے عہد کی مضبوطی ہے۔ اس کا نام اس کا دستور ہے۔ اس کی علامت اس کی آتش شوق ہے اور اس کا شغف اس کی صفت ہے۔

-37 عزت اس کی تعریف ہے۔ تمام سورجوں کی دنیائیں اس کا ایک میدان ہیں' ساری زندگیاں اور ہستیاں اس کا ایک محل ہیں۔ زندگی نے اس سے انس حاصل کیا ہے۔ عالم ناسوت اس کا بھید ہے۔ اس کی شان نامعلوم ہے۔ اس کا ناپید آشکارا ہے۔ مسرت اس کا باغ ہے اور رسوم و عادات کا مٹ جانا اس کی بنیاد ہے۔

-38 اس کے مددگار پناہ والے ہیں' اس کے اصول اللہ کی نوازش اور اس کا کرم ہیں' اس کا ارادہ پوچھا ہوا ہے۔ اس کے حامی منزل والے ہیں۔ اس کے رنج و غم شدت والے ہیں۔ اس کا گرد و پیش دھیما ہے۔ اس کا درد لگاتار ہے۔

- اس کا قول اصول ہے۔ یہی ہے جو ہمارے لئے کافی ہے اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ حیات انسانی کے لئے قہر و غضب ہے۔ بعد ازاں خدائے قدس کی طرف سے توفیق ہے۔ اس کے صحیفے مسلک والے ہیں۔ اس کے خزانے خاکی' اس کا قول اس کی حالت کا اصول ہے۔ یہ عاجز اور اس کے علاوہ' سب قہر و آفت ہے۔ محض وہی ہے جو اس عاجز کے لئے کافی ہے۔

سین الازل و الالتباس

1- کسی کا دعویٰ بھی آنحضرت ﷺ اور ابلیس کے سوا پورا نہیں اترا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ابلیس مقام ذات (عالم لاہوت) سے گر پڑا اور آنحضرت ﷺ پر ذات مطلق کا مقام منکشف کر دیا گیا۔

2- ابلیس سے کہا گیا "سجدہ کر" اور احمد ﷺ سے کہا گیا "دیکھیے" اس نے سجدہ نہیں کیا اور آنحضرت ﷺ نے نہیں دیکھا، یعنی آپ نے دائیں اور بائیں جانب التفات نہیں فرمایا۔ چنانچہ سورہ نجم 53-17 میں ہے۔ "نگاہ نہ بہکی اور نہ حد سے بڑھی۔" اس میں "مازاغ" سے دائیں طرف التفات اور ماطغیٰ سے بائیں جانب التفات مراد لیا گیا ہے۔ یعنی آپ کسی طرف ملتفت نہ ہوئے بلکہ مستقیم رہے۔

3- اس کے برخلاف احمد ﷺ نے دعویٰ کیا اور اپنی قوت سے لوٹ آئے۔

4- چنانچہ آپ کا قول ہے کہ "تیری طرف پلٹتا ہوں اور تجھ سے ہی غلبہ حاصل کرتا ہوں۔"
آپ فرماتے ہیں کہ "اے خدا، تو ہی دلوں کو پھیرنے والا ہے۔" اسی طرح آپ کا ارشاد ہے کہ "اے اللہ! میں تیری تعریف کا شمار اور احاطہ نہیں کر سکتا۔"

5- اور آسمان والوں میں ابلیس جیسا کوئی موحد اور عابد نہیں ہے۔

6- چونکہ ابلیس پر مقام لاہوت یعنی حقیقت ذات متغیر ہو گئی پھر بھی اس "سیر فی اللہ" کے مقام میں تمام لحات و ساعات کو ترک کر دیا اور مقام راز میں مفارقت اختیار کر لی اور زوائد کو چھوڑ کر معبود واحد کی پرستش اختیار کی۔

7- اور اس پر لعنت کی گئی جب وہ مقام تفرید تک پہنچا اور اسے دھتکار

دیا گیا۔ جب اس نے مزید طلب کیا اور انفرادیت کا خواہشمند ہوا۔

8- اس سے کہا گیا "سجدہ کر" جواب دیا "غیر کا وجود ہی نہیں۔" حق تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ "میری لعنت قیامت تک تجھ پر رہے گی۔" اس نے پھر کہا، "غیر کا وجود ہی نہیں۔" میری سرکشی تیرے بارے میں پاکیزگی ہے اور میری عقل تیرے بارے میں ایک دیوانگی ہے اور آدم بھی تیرے سوا کہاں ہے اور درمیان میں ابلیس ہوتا کون ہے؟

9- وہ بڑائی کے سمندر میں گر پڑا۔ ایسا نابینا ہو گیا اور کہنے لگا تیرے غیر کی طرف میرے لیے کوئی راستہ نہیں ہے اور میں ایک ایسا محبت کرنے والا ہوں جو دلیل و راہ نما ہے۔ حق تعالیٰ نے اس سے کہا کہ "تو نے تکبر کیا۔" اس نے کہا "اگر تیرے ساتھ مجھے ایک لمحہ بھی میسر آجائے تو میرے لیے تکبر و عظمت سزاوار ہے اور میں ہی ہوں جس نے ازل میں تجھے پہچانا ہے۔ میں اس سے بہتر ہوں اور خدمت میں اس سے قدیم ہوں اور کائنات میں مجھ سے زیادہ تجھے پہچاننے والا کوئی نہیں ہے۔ پس یہ کیسے ممکن کہ میں اس کو سجدہ کروں کیونکہ میں نے بہت زمانے تیرے ساتھ گزارے ہیں۔ وہ مجھ سے زیادہ عزیز اور بزرگ نہیں ہے۔" میرے لیے تیرے بارے میں ایک ارادہ ہے اور تیرے لیے میرے بارے میں ایک ارادہ ہے اور تیرا ارادہ میرے بارے میں سابق ہے اور فوقیت رکھتا ہے۔ میں تیرے غیر کو کس طرح سجدہ کروں۔ اگر میں نے سجدہ نہیں کیا تو میرے لیے اپنی اصل کی طرف لوٹنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آگ اپنی اصل یعنی آگ کی طرف لوٹتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تمام اندازہ اور اختیار تیرے ہاتھ میں ہے۔

1- میرے لیے تیری دوری کے بعد اب اور کوئی دوری اور جدائی

نہیں ہے جبکہ مجھے یقین ہوگیا کہ دوری اور نزدیکی ایک ہے۔ اگر میں جدا کر دیا گیا ہوں تو بلاشبہ تیری جدائی میرا ساتھی ہے اور تکبر و محبت دونوں کیسے ایک صحیح ہوسکتے ہیں۔ تیرے لیے اس توفیق عطا کرنے پر بھی خلوص تعریف ہے' میری دوری اور جدائی کا سبب میری لغزش ہے۔ میں ایک بے عیب بندہ ہوں۔ میرے لیے یہ سزاوار نہیں ہے کہ میں تیرے غیر کا سجدہ گزار بنوں۔

11- موسیٰ علیہ السلام کوہ طور کی ایک گھاٹی پر ابلیس سے ملے تو اس سے کہا۔ اے ابلیس کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے باز رکھا تھا؟ اس نے کہا' مجھے میرے اس دعوے نے سجدہ سے باز رکھا کہ معبود صرف ایک ہی ہے اور اگر میں آدم کو سجدہ کرتا تو میری مثال بھی آپ جیسی ہوتی۔ کیونکہ آپ کو ایک ہی دفعہ پکارا گیا۔ **انظر الی الجبل** (اے موسیٰ پہاڑ کی طرف دیکھ) تو آپ نے پہاڑ کی طرف دیکھا اور مجھے ایک ہزار دفعہ پکارا گیا کہ آدم کو سجدہ کر' مگر میں نے اپنے دعوے کی معنویت کی وجہ سے سجدہ نہیں کیا۔

12- موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تو نے ایک حکم کو ترک کر دیا ہے۔ جواب دیا کہ وہ ایک آزمائش تھی اس کو حکم نہیں کہنا چاہیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر فرمایا کہ اب تیری حالت اور صورت بدل گئی۔ ابلیس نے کہا یہ سب ایک قسم کا پردہ اور چھپانا ہے اور "حال" سو اس پر بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ وہ ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلتا رہتا ہے اور معرفت ایک ہی حال پر صحیح قائم رہتی ہے۔ وہ نہیں بدلتی ہے۔ یہ شخص ہے جو بدل جاتا ہے۔

13- پس موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ کیا اب تو اسے یاد کرتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اے موسیٰ یہ فکر کا مقام ہے' ذکر کا مقام نہیں

ہے۔ اس مقام پر یاد نہیں کرتے ہیں۔ میں بھی مذکور ہوں وہ بھی مذکور ہے۔ اس کا ذکر میرا ذکر اور میری یاد اس کی یاد ہے--- کیا ذکر کرنے والے اکٹھے ہوتے ہیں۔ میری خدمت اب زیادہ صاف اور واضح ہے۔ میرا وقت اب زیادہ اچھا اور خوشگوار ہے اور میری یاد اب زیادہ روشن اور عام ہے' کیونکہ میں ہمیشگی سے اس کی خدمت اپنے حصے اور نصیب کی خاطر کرتا تھا لیکن اب اس کی خدمت اسی کی خوشنودی اور رضامندی کے لیے کرتا ہوں۔

14- میں نے لالچ درمیان سے اٹھا دی ہے۔ نفع و نقصان اور روک ٹوک کا جھگڑا ختم ہوگیا ہے۔ مجھے منفرد کر دیا' مجھے یکتائے زمانہ بنا دیا' مجھے حیرت میں ڈالا اور مجھے دھتکارا تاکہ میں مخلص حضرات سے گھل مل نہ سکوں۔ میرے جذبہ غیرت کی بنا پر اغیار کے ساتھ ملنے سے مجھے روک دیا۔ میرے مقام حیرت کی بناء پر مجھے متغیر کر دیا۔ میری اجنبیت اور انفرادیت کی وجہ سے مجھے حیرت میں ڈالا' میری ہم نشینی کے سبب مجھے باز رکھا۔ میری خوبی کی بنا پر مجھ میں برائی ڈالی۔ میرے ہجر کی وجہ سے مجھے محروم و ناامید کیا' میرے مکاشفہ کی وجہ سے مجھے چھوڑا۔ میرے مقام وصل کے سبب مجھے آشکارا کیا۔ مجھے منقطع کرنے کے لیے مقام وصل دیا اور میری آرزو کو روکنے کی خاطر مجھے الگ کیا ہے۔

15- اور اس کے حق میں میں نے کسی تدبیر کے سلسلے میں کوئی خطا نہیں کی ہے' نہ میں نے اس کی تقدیر کو رد کیا ہے اور نہ اس صورت حال کے بدلنے پر میں نے فخر کیا ہے۔ ان تمام اندازوں میں میرے لیے خدا کی مشیت اور تقدیر ہے۔ اگر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھے جہنم کی آگ سے عذاب دے تب بھی میں غیر کو سجدہ نہیں کروں گا اور نہ کسی جسم اور شخص کے سامنے جھکوں گا میں اس کا کوئی مدمقابل نہیں پہنچاتا اور نہ

میں کوئی اس کا بیٹا مانتا ہوں۔ میرا دعویٰ سچے لوگوں کا دعویٰ ہے اور میں اپنی محبت میں سچے لوگوں میں سے ہوں۔

16- ابلیس آسمان میں بھی داعی ہے اور زمین میں بھی داعی ہے۔ آسمان میں وہ فرشتوں کو بلاتا ہے تاکہ وہ انہیں اچھائیاں دکھا دے اور زمین میں انسانوں کو بلاتا ہے تاکہ انہیں برائیاں دکھائے۔ جہاں تک بندگی و اطاعت کا تعلق ہے وہ آسمانوں میں فرشتوں کا معلم تھا۔

17- یہ اس لیے کہ چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ جس طرح ریشمی کپڑے کے سفید ٹکڑوں کو سیاہ پلاٹ کے ساتھ پیوست کر دیا جائے' وہ پہچانے جاتے ہیں' فرشتہ اچھائیاں پیش کرتا ہے اور نیک کردار انسان سے کہتا ہے کہ اگر تو ان کو کرے گا تو اس میں واضح اشارہ ہے کہ تجھے اس کا بدلہ ملے گا اور جو شخص بد کو نہیں پہچانتا وہ خوب کو بھی نہیں جانتا ہے۔

18- میں نے فتوت کے بارے میں ابلیس اور فرعون سے مناظرہ و مقابلہ کیا ہے۔ پس ابلیس نے مجھ سے کہا کہ اگر میں سجدہ کرتا تو جوانمردی کے لفظ کا مجھ پر اطلاق نہ ہوتا۔ پھر فرعون نے کہا کہ اگر میں اس کے رسول (موسیٰ) پر ایمان لے آتا تو میں جوانمردی کے مرتبے سے گر پڑتا۔

19- اور اس کے بعد میں نے کہا کہ اگر میں اپنے قول اور دعوے سے پھر جاؤں تو میں جوانمردی کے مقام سے گر پڑوں گا۔

20- ابلیس نے کہا۔ "میں اس سے بہتر ہوں۔" کیونکہ اس نے اپنے علاوہ کسی کو غیر کو نہیں دیکھا۔ اسی طرح فرعون نے کہا۔ "میں تمہارے بارے میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا کوئی معبود ہو۔" جب اس نے یہ معلوم کرلیا کہ اس کی قوم میں اب کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو حق و باطل یا معبود و مخلوق میں تمیز کرسکے۔

21- پس اس میدان میں میرے ساتھی اور میرے استاد ابلیس اور

فرعون ہیں۔ چنانچہ ابلیس کو آگ میں ڈالا گیا لیکن وہ بھی اپنے دعوے سے باز نہیں آیا اور اس نے قطعاً کسی واسطے سے اقرار نہیں کیا۔

22- اور اگر مجھے قتل کریں یا سولی پر لٹکائیں یا میرے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے جائیں تب بھی میں اپنے دعوے سے باز نہیں آؤں گا۔

23- ابلیس کا اسم اس کی ذات ہی سے نکلا ہے۔ پھر وہ "عزازیل" سے بدل دیا گیا۔ اس لفظ میں "ع" کا تعلق اس کی ہمت سے ہے اور پہلی "ز" طلب میں زیادتی اور اضافہ کے لیے ہے۔ "الف" سے مراد اس کی الفت میں اضافہ ہے۔ دوسری "ز" اس کے مرتبہ زھد کو ظاہر کرتی ہے اور "ی" اس کی جائے پناہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جب وہ پناہ چاہتا ہے "لام" کا اشارہ اس لڑائی اور جدوجہد کی جانب ہے جس کو وہ اپنی آزمائش میں جاری رکھنا چاہتا ہے۔ مختصر یہ کہ "ع" علاقہ کے لیے' پہلی "ز" زیادتی طلب کے لئے' "الف" الفت کے لیے اور دوسری "ز" زھد کے لیے' "ی" (وہ پناہ لیتا ہے) کے لیے اور "ل" مجادلہ کے لیے ہے۔

24- پروردگار نے اس سے کہا کہ اے ذلیل و خوار کیا تو سجدہ نہیں کرے گا؟ اس نے جواب دیا کہ میں محب (محبت کرنے والا) ہوں اور محبت کرنے والا ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ اور میں نے کتاب مبین (قرآن مجید) میں بھی لفظ (ذلیل و خوار) پڑھا ہے۔ اے زبردست قوت والے! وہ کیا چیز ہے جو میرے لیے جواز پیش کرتی ہے کہ اس کے لیے فروتنی کروں' یعنی آدم کو سجدہ کروں۔ حقیقت یہ ہے کہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ اور یہ دونوں ضدیں ہیں جو آپس میں موافقت نہیں کرتی ہیں۔ جہاں تک مقابلہ کا تعلق ہے' میں خدمت میں اس سے زیادہ قدیم' افضل و کمال میں اس سے بزرگ'

علم ودانش میں اس سے زیادہ دانا اور عمر میں اس سے زیادہ کامل ہوں۔

25- حق تعالیٰ شانہ نے اس سے کہا کہ اختیار میرے لیے ہے۔ تیرے لیے نہیں ہے۔ اس نے جواب دیا کہ تمام اختیارات بلکہ میرا اختیار بھی سب کے سب تیرے لیے ہیں اے مالک و خالق۔ بے شک تو نے میرے لیے جو پسند کرلیا ہے، ٹھیک کیا ہے۔ اگر تو نے مجھے اس کو سجدہ کرنے سے روکا ہے تو تیری ذات بلند ہے اور اگر میں نے گفتگو میں کوئی خطا کی ہے تو مجھے ترک مت کر، کیونکہ تو سب کچھ سننے والا ہے اور اگر تو نے یہ چاہا ہے کہ میں اسے سجدہ کروں تو پھر میں فرمانبردار ہوں۔ عرفا کی جماعت میں کوئی شخص میں ایسا نہیں جانتا ہوں جو مجھ سے زیادہ تجھے پہچاننے والا ہو۔

26- مجھے ملامت نہ کر۔ کیونکہ ملامت کا شیوہ مجھ سے بعید ہے اور میرے آقا! مجھے بدلہ دے کیونکہ میں اپنے مقام میں یکتا ہوں۔ بلاشبہ جہاں تک تیرے وعدے کا تعلق ہے، تو وہ ایسا وعدہ ہے جو یقیناً سچا ہے اور جہاں تک میرے معاملے کا تعلق ہے تو اس کا آغاز کار سخت ہے، جو حضرات بھی کوئی تحریر چاہتے ہیں ان سے میری گزارش ہے کہ دوستو! پڑھو۔ اور معلوم کرو۔۔۔ کہ فی الواقع میں شہید ہوں۔

27- اے میرے بھائی ابلیس کا نام عزازیل اس لیے رکھا گیا کہ اس نے علیحدگی اختیار کی اور اپنے عہدہ ولایت سے معزول ہوگیا وہ اپنے آغاز سے انجام کی طرف نہیں لوٹا اس لیے کہ وہ اپنے مقام نہایت سے نکلا ہی نہیں اور ابتدا ہی سے شقی (بدبخت) نکلا ہے۔

28- اس کا نکلنا دراصل اپنی بنیاد اور سرشت میں ثابت قدم رہنے کی وجہ سے ایک الٹی چال ہے۔ یعنی وہ نکلنے کے بجائے مزید اپنی بنیاد اور سرشت پر جما ہوا ہے اور اس کا خروج ایک ایسی آگ سے مشتعل ہے جو درازی سفر اور تھکن سے تنگ آکر آرام لینے کی خاطر سینہ میں موجزن

ہوتی ہے اور ایک ایسے نور سے روشن ہے جو اس کی تیز روی کے جذبہ پر دلالت کرتا ہے۔

- اس پیراگراف میں شراہمہ، برہمہ، مضل، میص، صواری، نطیہ جیسے الفاظ لکھے گئے ہیں جو لغت کی کتابوں میں موجود نہیں ہیں۔

- اے بھائی! اگر تو سمجھ جاتا تو یقیناً الگ ہو جاتا اور بہت زیادہ منقطع ہو جاتا اور سخت گمان کرتا اور شدت غم سے لوٹ جاتا اور کثرت رنج سے فنا ہو جاتا۔

- قوم کے تمام فصحاء و بلیغ لوگ اس کے بارے میں گونگے ہوگئے اور جتنے عارف لوگ تھے، عاجز آگئے اور اس کے بارے میں کچھ بتلا نہیں سکے۔ وہ ہی ہے جو ان میں سب سے زیادہ حقیقت سجدہ کا جاننے والا ہے۔ موجودات میں سب سے زیادہ قربت رکھنے والا ہے۔ اپنی صلاحیت اور طاقت کو سب سے زیادہ صرف کرنے والا ہے اور دوسروں کے مقابلے میں قول و اقرار کو زیادہ پورا کرنے والا ہے اور معبود حقیقی کے ساتھ سب سے زیادہ قربت رکھنے والا ہے۔

3- آخر کار اس کا معاملہ مشتبہ ہوگیا اور اس کا گمان بگڑ گیا۔ اس پر اس نے کہا: "میں اس سے بہتر ہوں۔" وہ مستقل طور پر حجاب میں پڑ گیا۔ خاک میں غلطان رہا اور ابدالاباد تک عذاب سے پیوستہ ہوگیا۔

طاسین المشیہ

- مشیت میں پہلا دائرہ ارادہ خداوندی کا ہے۔ دوسرا دائرہ اس کی حکمت کا، تیسرا دائرہ اس کی قدرت کا اور چوتھا دائرہ اس کی معلومات اور ازلیت کا ہے۔

2- ابلیس کا کہنا ہے کہ اگر میں پہلے دائرے میں داخل ہوتا تو دوسرے میں مبتلا کر دیا جاتا۔ اگر دوسرے دائرے میں باقی و ثابت رہتا تو تیسرے دائرے میں مبتلا ہو جاتا اور اگر میں تیسرے پر قناعت کرلیتا تو پھر چوتھے دائرے میں مبتلا کر دیا جاتا۔

3- پس نہیں، ہرگز نہیں، مطلق نہیں۔ میں پہلے ہی پر باقی رہا۔ یعنی مقام "لا" ہی میں رہا۔ دوسرے دائرے کی طرف مجھے لعنت کی گئی اور تیسرے کی جانب مجھے پھینک دیا گیا اور چوتھا دائرہ میری نسبت سے کہاں ہے۔ "لا" کا چار مرتبہ تکرار اس لیے کیا ہے کہ اوپر چار دائروں کا ذکر ہے۔ گویا پہلا مقام نفی ہے، دوسرا مقام لعنت ہے اور تیسرا مقام رد ہے۔

4- اگر میں یہ جانتا کہ آدم کو سجدہ کرنا مجھے نجات دلا دے گا تو میں سجدہ کرلیتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس دائرے کے پیچھے بھی اور دائرے ہیں۔ یعنی مقام سجدہ آدم کے پرے بھی اور مقامات امتحان و ابتلا ہیں۔ میں نے اپنے دل میں یہ بات کہی کہ مجھے بخش دے۔ اگر میں اس دائرے سے نجات بھی پالوں، تب بھی دوسرے، تیسرے اور چوتھے سے کیسے نجات پاؤں گا۔

5- پانچواں دائرہ الف ہے جو احدیت کے مقام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یعنی وہی ایک ہے۔ لاشریک لہ اور اسی سے ھوالحی مراد ہے۔ یعنی حقیقی طور پر زندہ وہی ہے۔ باقی سب مردہ ہیں۔

طاسین التوحید

1- الفاظ پیچیدہ ہونے کے باعث ترجمہ نہ ہوسکا۔

2- حق سبحانہ، تعالیٰ ایک ہے۔ یکتا ہے اور یگانہ ہے اور اسی کا ایک ہونا مسلم ہے۔

3- واحد اور توحید، سو ایک کا تعلق حروف "فی" سے ہے اور دوسرے کا تعلق حرف "عن" سے ہے۔

4- اس سے مراد انقطاع ہے۔ انقطاع کی ایک صورت ظاہر کر دی گئی ہے۔

5- توحید کا علم مفرد اور مجرد ہے۔ یعنی علم تفرید و تجرید دونوں پہلو رکھتا ہے۔ تفرید میں اپنے نفس کی نفی ہے اور تجرید میں اغیار کی اور توحید کی صورت یہ ہے:

6- توحد، موحد کی صفت ہے۔ موحد جس کی توحید کی گئی اس کی صفت نہیں ہے۔ پس اس کو صورت موحد کہو، صفت موحد نہ کہو۔

7- میں اگر "انا" کہوں تو وہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ "انا" میرے لیے ہے۔ پس اس میں تیرے لیے "لا" ہے اور "انا" اسی کے لیے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں کہوں کہ میں "وہ" ہوں تو میں "وہ" نہیں ہو جاؤں گا۔ وہ وہی رہے گا کیونکہ وہ مجھ سے میرے "انا" کہنے سے اور میری توحید بیان کرنے سے پاک صاف اور بلند ہے۔

8- اگر میں کہوں کہ توحید کی بازگشت موحد کی طرف ہے تو میں نے توحید کو مخلوق بنا دیا ہے۔ کیونکہ موحد وہ ہے جو عقیدہ توحید رکھتا ہے۔ عقیدہ کا رکھنے والا بہرحال مخلوق ہے۔

9- اور اگر میں کہوں کہ توحید موحد کی طرف لوٹتی ہے تو جو خود اپنی ذات سے ایک ہو اس کو کسی کے ایک ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چونکہ وہ یگانہ و یکتا ہے اس لیے وہ توحید بھی جو ایک موحد کی صفت ہے

اس کی شان اعلیٰ و ارفع کے سزاوار نہیں ہے۔ اس توحید سے بھی اس کی احدیت کا حق ادا نہیں ہوتا ہے۔

10- اور اگر میں توحید کی نسبت موحد کی طرف کروں تو پھر میں نے ایک قسم کی حد بندی کر دی ہے اور وہ لامحدود ہے۔

طاسین الاسرار فی التوحید

1- بھیدوں کا سرچشمہ اسی سے پھوٹتا ہے' یہ بھید اسی کی طرف خیالات لے جاتے ہیں کیونکہ وہی ان کی الہام کرنے والا ہے۔ توحید کے اسرار آسان نہیں ہیں' وہ خیال اور وسوسہ پیدا کرتے ہیں۔

2- توحید کے دقیق معنی ہی اس کی ضمیریں ہیں۔ اس واسطے کہ "انی" ایک پوشیدہ مقام ہے بلکہ اس کو بھی خود مضمر خیال نہ کرو۔ اس کی ضمیر سمجھو' اس کی ذات ہی اس کا اہم اشارہ بن سکتی ہے۔ توحید کی ضمیر منقلب ہے۔ وہ حقیقی اعتبار سے ضمیر' مضمر اور ضمائر کی قید میں نہیں ہے یہی "ھا" خود اس کی ذات ہے۔ یہی "ھا" عالم ہاہوت ہے۔ وہ ہماری توحید بیان کرنے سے ایک نہیں بنا ہے۔

3- اگر تو نے واہ واہ کیا یعنی اظہار تعجب کیا تو لوگ "افسوس" کا اظہار کریں گے۔

4- یہ سب الوان و انواع ہیں اور اشارہ ایک ناقص چیز کی طرف نہیں پہنچتا ہے۔ الوان (رنگ) انواع (قسمیں) سب عالم اجسام میں داخل ہیں جو نامکمل ہیں۔

5- گویا "وہ مضبوط چٹان کی مانند ہیں۔" حقائق مضبوط چٹانوں کی مانند ہیں۔ یہ ایک حد ہے۔ دو چیزوں کے درمیان۔ ایک خط یا جدا کرنے والی شے اور اس کی احدیث اس حد کو غیر کے حکم سے مستثنیٰ نہیں کرتی

ہے۔ گویا وہ بھی غیر کے حکم میں شامل ہے اور یہ حد کا درجہ بھی بہت تیز ہے۔ اور حد کی جتنی بھی تعریفات یا معانی ہوں گے وہ محدود کے لیے ہی ہو سکتے ہیں اور جس کی توحید کی گئی ہے اس کی حد بندی نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ لامحدود ہے۔

6- "حق" جہاں تک مخلوق کا تعلق ہے وہ اس کی طرف جائے بازگشت ہے۔ یہ حق نہیں ہے۔ قبلہ اصل میں قبلہ نما ہے' کعبہ اس معبود حقیقی کا پتہ بتلانے والا ہے۔ خود بذاتہ مسجود نہیں ہے۔ وہ مخلوق کی عقل' فہم' بصیرت کی حد سے بہت بلند ہے۔

7- توحید قول نہیں ہے' کیونکہ گفتگو درحقیقت دو ایسی چیزیں ہیں جن کا مخلوق کے لیے ایک ہونا درست نہیں ہے۔ پس حق کے لیے یہ بات کیسے صحیح ہو؟

8- اگر میں یہ کہوں کہ "توحید" اس سے پیدا ہوئی' تو میں نے ایک ذات کو دو ذاتوں میں بدل دیا ہے۔ چونکہ جب ذات پیدا ہوئی تو ذات کی یکتائی نہ رہی اور وہ یگانہ و یکتا ذات ہے اور یہ اسی وقت تک ہے جب تک اس کے مقابلے میں کوئی ذات نہ ہو۔ اگر کوئی مقابلہ میں ذات ہو تو پھر یکتائی ذات کا تصور باقی نہیں رہتا۔ پس یہ کہنا کہ توحید اس سے پیدائی ہوئی۔ درحقیقت اس کی یکتائی کی تعریف نہ ہوئی۔

9- جب وہ ظاہر ہوا تو اس نے خود کو پوشیدہ کر دیا مگر وہ کہاں پوشیدہ ہوا۔ کیونکہ وہ کونسی جگہ ہے جہاں وہ نہیں ہے۔ "این" و "ان" اور "ماذا" اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ گویا انسانی ادراک' اس کا علم اور اس کا فہم وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔

10- اس کی وجہ یہ ہے کہ "تک" بھی اس کی مخلوق ہے اور "کہاں" بھی اس کی مخلوق ہے اور مخلوق کی رسائی وہاں تک محال ہے۔ وہ زمان و

مکان کی قید سے آزاد ہے اور مخلوق زمان و مکان میں مقید ہے۔

11- جو چیز عرض قبول کرتی ہے وہ جوہر کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ جو جسم سے جدا نہ ہو وہ جسم کے علاوہ نہیں ہے اور جو چیز روح سے الگ نہ ہو وہ روح ہی ہوسکتی ہے۔ یہ ایک قسم کا لطیف مادہ یا روحانی خوشو ہے۔

12- اب ہم نے ان چیزوں کی طرف رجوع کرلیا ہے جو احاطہ کرلیتی ہیں ان چیزوں کا جو پسندیدہ' گوارا' مکرر اور متفرقات میں شامل ہیں اور یہی گمان کی ہوئی ہین۔

13- پہلی شق کا تعلق مفعولات سے ہے۔ یعنی ان چیزوں سے ہے جو اثر و فعل قبول کرلیتی ہیں۔
دوسرے نمبر کا تعلق مرسومات سے ہے۔ یہ کائنات کے دائرے' نقوش اور علامات ہیں۔

14- توحید کی حقیقت کا مرکزی نقطہ اس سے مراد ہے۔ توحید مطلقاً" مراد نہیں ہے۔ خواہ اس سے دائرہ جدا ہی کیوں نہ ہو۔

طاسین التنزیہ

1- اور اس کے لیے عالم مثال کا دائرہ ہے۔

2- یہ سب باتیں' زمانے' نظریے اور مختلف طریقے رکھنے والے لوگوں کے اقوال کی رو سے حرف ابجد کے اعداد کا حساب ہیں۔

3- پہلا اس کا ظاہر ہے' دوسرا اس کا باطن ہے اور تیسرا اس کا اشارہ ہے۔

4- یہ سب پیدا کیے ہوئے' محترک' گردش کے مرکز اور منقلب مخلوط و نامعلوم' فریب خوردہ اور شکستہ و گونسار ہیں۔ زمان و مکان' عقائد اور

نظریے اور علوم و معارف' سب کے سب حادث اور مخلوق ہیں۔ اس کی ذات ان سے پاک ہے۔

5- ضمیروں کی پوشیدگیوں میں رواں دواں ہیں۔ متردد و متحیر ہیں۔ متزلزل ہیں اور سرگردان و پریشان ہیں۔

6- یہ مخلوقات ہیں ادلتی بدلتی چیزیں ہیں۔ حق ان انسانوں سے پاک اور بری ہے۔

7- اگر میں یہ کہوں کہ "اوست" "وہ ہے" تو پھر توحید کے بارے میں کچھ نہیں کہیں گے۔

8- اور اگر میں کہوں کہ توحید حق صحیح ہوگئی ہے تو کہیں گے کہ "درست ہوگئی" تعجب کریں گے۔

9- اگر میں اس کے بارے میں "نئے زمان" کہوں تو پھر کہیں گے کہ توحید کے معنی تشبیہ کے ہوئے اور تشبیہ حق تعالیٰ کے اوصاف کے لائق نہیں ہے۔ اسی طرح توحید کی نسبت حق کے ساتھ نہیں کی جاسکتی ہے اور نہ ہی اس کی نسبت مخلوق کی طرف کی جاسکتی ہے۔ اس واسطے کہ کوئی شمار اور گنتی ہو' سو اس کی بہرحال ایک حد ہے' اگر توحید میں زیادتی کی جائے تو حادث لازم آئے گا اور حادث حق کی صفت نہیں ہوتی ہے ذات تو واحد ہے' حق اور باطن عین ذات سے نہیں پیدا ہوئے۔

10- اگر یہ کہا جائے کہ "توحید کلام ہے" تو کلام ذات کی صفت ہے۔

11- اگر میں کہوں کہ "اس نے ارادہ کیا کہ وہ واحد ہو جائے گا۔" تو ارادہ ذات کی صفت ہے اور جن چیزوں کا ارادہ کیا جائے وہ مخلوق ہیں۔

12- اگر میں کہوں کہ "اللہ ذات کی توحید ہے" تو میں نے اس کو مخلوق گردانا ہے۔

13- اور اگر یہ کہوں کہ "وہ ذات نہیں ہے" تو میں نے اس کو مخلوق

گردانا ہے۔

14- اور اگر میں یہ کہوں "اسم اور مسمی دونوں واحد ہیں" تو پھر توحید کیا ہوئی؟

15- اور اگر "اللہ اللہ" کہوں تو پھر اللہ عین عین ہوگا۔ یعنی "وہ وہی ہے۔"

16- یہ مقام اسباب و توجیہات کی نفی کے راز کا مقام ہے اور یہ دائرے ان مختلف لام الفوں کی شکل میں اس کی صورت ہے۔ (لام الف = لا)

17- پہلا لام الف ازل ہے۔ دوسرا وہ ہے جس کا تعلق مفہومات سے ہے۔ تیسرا جہت ہے اور چوتھا وہ ہے جس کا تعلق معلومات سے ہے۔

18- یاد رہے کہ ذات صفات کے سوا نہیں ہے۔

19- پہلے وہ علم کے دروازے سے آتا ہے اور نہیں دیکھتا ہے پھر وہ "صفا" کے دروازے سے آتا ہے اور نہیں دیکھا ہے۔ پھر وہ "فہم" کے دروازے سے آتا ہے اور نہیں دیکھتا ہے اور پھر معنی کے دروازے سے آتا ہے اور نہیں دیکھتا ہے۔ گویا نہ ذا (ذات) سے نہ شا (شے) سے نا قا (قال، گفتگو) سے اور نہ ما (ماہیت) سے دیکھتا ہے۔

20- تمام عزت اس خدا کے لیے ہے جو محض اپنی پاکیزگی کی وجہ سے معارف والوں کے طریقوں اور کشف و کرامات والوں کی سمجھ سے بری اور پاک ہے۔

21- یہ مقام نفی و اثبات کے راز کا مقام ہے۔

22- پہلا نقش فکر عام ہے اور دوسرا فکر خاص اور جو دائرہ ہے وہ علم حق ہے ان میں سے جو درمیانی ہے، وہ ان کا مدار ہے اور جو الف لام دائرے کے ساتھ ہیں وہ تمام اطراف کی نفی ہیں۔

وہ دوھا (ح۔ مخفف حامل) اطراف سے اجنبیوں کو اٹھانے والی ہیں۔ ماسوا

کو دور کرنے والی ہیں۔ پس توحید رہ جاتی ہے اس کے ماوراء حوادث ہیں یعنی عدم سے وجود میں آنے والی چیزیں ہیں۔

23- عوام کا فکر توہمات کے سمندر میں غوطہ زن رہتا ہے۔ خواص کا فکر عقل و فہم کے سمندر میں شناوری کرتا ہے مگر بالاخر یہ دونوں سمندر خشک ہو جاتے ہیں۔ راستہ فرسودہ ہو جاتا ہے اور دونوں فکریں راہ سے ہٹ جاتی ہیں۔ اب وہ دونوں حامل مضمحل اور کمزور پڑ جاتے ہیں۔ دونوں جہاں فنا ہو جاتے ہیں۔ جہتیں دم توڑ دیتی ہیں اور علم و معرفت لاشے ہو جاتے ہیں۔

24- الوہیت کی یادگار سے صرف اس ذات کی صفت رحمان کا نور جلوہ گر ہو جاتا ہے جو پاک ہے اور حدوث قبول نہیں کرتی ہے۔ پس پاک ہے وہ خدا جو تمام عیوب سے مبرا ہے جس کی حجت قوی ہے جس کی قدرت غالب ہے اور جو جلال، بزرگی اور عظمت والا ہے۔ اس کا لامحدود اور بے شمار ہونا بھی ایک ہے مگر وہ ہمارے ایک کی طرح ایک نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حد اور شمار، انتہا اور ابتدا ایسی چیزیں ہیں جو اس تک راہ نہیں پاسکتی ہیں۔ بلاشبہ وہ کائنات کا پیدا کرنے والا ہے اور کائنات سے پاک ہے اس کو اس کے سوا، اور کوئی نہیں پہچان سکتا ہے۔ وہ بزرگی اور حرمت والا ہے اور وہی روحوں اور جسموں کو پیدا کرنے والا ہے۔

طاسین المعرفۃ

1- جس طرح معرفت نکرہ کے ضمن میں پوشیدہ ہے اسی طرح نکرہ معرفت کے ضمن میں پوشیدہ ہے۔ نکرہ عارف کی صفت ہے اور جہل اس کی صورت ہے۔ پس معرفت کی صورت یہ ہے کہ وہ عقلوں سے غائب ہونے والی اور نظروں سے پوشیدہ ہونے والی چیز ہے۔

کسی نے اس کو کیونکر پہچانا ہے؟ اس لیے کہ اس عالم قدر میں "کیسے" اور "کیونکر" کو دخل نہیں ہے۔ پھر اس کو کسی نے "کہاں" پہچانا ہے؟ اس واسطے کہ "کہاں" کی گنجائش بھی وہاں نہیں ہے۔ کوئی وہاں تک کیسے پہنچا؟ جب کہ معرفت کی رسائی وہاں تک نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی اس سے کیسے جدا ہوا؟ کیونکہ جدائی کا پرندہ بھی وہاں پر نہیں مار سکتا۔

معرفت ایک محدود کے لیے' ایک ایسی چیز کے لیے جو شمار میں آسکتی ہو' جو کوشش کی محتاج ہو اور طبعاً مغلوب ہو' ہرگز سزاوار نہیں ہوسکتی ہے۔

2- معرفت نہ صرف ان چیزوں ہی سے اوجھل ہے جو ہماری نظروں سے پرے ہیں بلکہ ہر وہ چیز کی غایت اور فقہی سے بھی پرے ہے۔ حتیٰ کہ وہ ہمت کی حدود سے بھی پرے ہے۔ بھیدوں کی دنیا سے بھی پرے ہے۔ "خبر" اور "نظر" کے عالم سے بھی پرے ہے اور ادراک کی کمند سے بھی پرے ہے۔

یہ ہے وہ دنیا جو سب کی سب "شے" کے ضمن میں آتی ہے۔ جو شروع میں نہیں تھی مگر بعد میں پیدا ہوئی اور وہ چیز جو ابتدا میں نہ ہو لیکن بعد میں وجود میں آئے وہ اپنی ذات کے لیے مکان کی محتاج ہوتی ہے۔ اس

کے برعکس ایک ایسی ہستی جو ہمیشہ سے ہو جو اطراف و جوانب اور اسباب و ذرائع سے پہلے ہو اس کو سمتیں اور طرفین کیسے گھیر سکتی ہیں اور حدود و نہایات کیسے چھو سکتی ہیں۔

3- اور جو یہ دعویٰ کرے کہ اس نے فنائے نفس کے ذریعے "اس کو" پہچان لیا ہے تو کس طرح ایک فانی اور مفقود' ایک باقی اور موجود کو پہچان سکتا ہے۔

4- اور جو شخص یہ کہے کہ میں نے اس کو اپنی ہستی کے ذریعے پہچانا ہے تو دو قدیم بیک وقت کیسے جمع ہوسکتے ہیں۔

5- اور جو یہ کہے کہ میں نے اس کو اس وقت پہچانا جب اس کی حقیقت مجھ پر مجہول ہوگئی اس صورت میں جہل حجاب ہے اور معرفت حجاب سے ماورا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں رہتی ہے۔

6- اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے اس کو "اس" کے ذریعے پہچانا ہے تو اسم مسمی سے علیحدگی اختیار نہیں کرتا ہے کیونکہ اس کا تعلق مخلوق سے نہیں ہے۔

7- اور جو یہ ثابت کرے۔ میں نے اس کو اسی کی ذات کے ذریعے پہچانا ہے تو اس صورت میں بھی اس نے گویا دو معروف کی جانب اشارہ کیا ہے حالانکہ معروف ایک ہی ہے۔

8- اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے اس کو محض اس کی صنعت گری اور قدرت کے ذریعے پہچانا ہے۔ تو اس نے صانع کو چھوڑ کر صرف صنعت پر اکتفا کرلیا ہے۔

9- اور جو آدمی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے اس کو اپنے عجز کی وجہ سے پہچان لیا ہے تو ایک عابد کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا سلسلہ معروف سے منقطع ہوتا ہے اور جس کا سلسلہ منقطع ہو وہ معروف کا کیسے ادراک

کرسکتا ہے۔

10- اور جس شخص نے یہ بات کہی کہ جس طرح اس نے مجھے پہچاننے کا علم دیا۔ اسی کے مطابق میں نے اس کو پہچانا ہے، اس صورت میں قائل نے اپنے علم کی طرف اشارہ کیا ہے اور معلوم کی جانب لوٹ گیا ہے۔ چونکہ معلوم ذات سے الگ ہوتا ہے۔ لہٰذا جس نے ذات سے جدائی اختیار کرلی وہ کیسے ذات کا ادراک کرسکتا ہے۔

11- اور جس نے یہ بات کہی کہ جس طرح خود اس نے اپنی ذات کا وصف بیان کیا ہے اسی کے مطابق میں نے اس کو پہچانا ہے۔ سو اس شخص نے اثر کو چھوڑ کر خبر پر قناعت کرلی ہے۔

12- اور جس نے یوں کہا کہ میں نے اس کو دو حدوں پر پہچانا ہے، سو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ معروف واحد شے ہے اور وہ جگہ قبول کرنے اور جز ہونے کی گنجائش نہیں رکھتا ہے۔

13- اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ معروف ہی نے اپنے آپ کو پہچانا ہے، وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ عارف جدائی میں مبتلا ہے اور دوری و علیحدگی کا متکلف ہے۔ کیونکہ معروف ہمیشہ اپنے نفس کا عارف رہا ہے۔

14- عجیب بات ہے کہ ایک ایسا شخص جو یہ نہیں جانتا ہے کہ اس کے بدن پر کالا بال کیوں اور سفید بال کس لیے اگتا ہے، وہ کیسے دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ تمام چیزوں کے خالق کو پہچان سکتا ہے؟

ایک ایسا انسان جو مجمل اور مفصل کو نہیں جانتا، جو اسباب و علل کو نہیں سمجھتا اور جو حقائق و لطائف پر نظر نہیں رکھتا اس کا دعویٰ معرفت ایک ایسی ذات کے لیے جو دائمی اور ابدی ہے کیونکر درست تسلیم کیا جاسکتا ہے؟

15- پس وہ ذات پاک ہے جس نے ان معرفت کے دعویٰ کرنے والوں

پر کہیں الفاظ و اسماء کے، کہیں نقوش و رسوم کے اور کہیں عادات و علامات کے پردے ڈال رکھے ہیں۔ کہیں اس نے قال کے بھیس میں کہیں حال کے لباس میں، کہیں کمال کے پیراہن میں، کہیں جمال کے پردے میں اپنے حسن جہاں آرا کو چھپا رکھا ہے۔

دل ایک ایسا گوشت کا لوتھڑا ہے جو بدن کے کھوکھلے حصے میں واقع ہے۔ معرفت وہاں کیسے سما سکتی ہے کیونکہ وہاں ایک جوہر ربانی ہے۔

16- سمندر عقل کے لیے طول عرض یعنی لمبائی اور چوڑائی ہے۔ بندگی اور اطاعت کے لیے سنتیں اور فرائض ہیں اور تمام مخلوق اس زمین و آسمان کے دائرے میں محصور ہیں۔

17- مگر معرفت کے لیے طول و عرض نہیں ہے۔ نہ وہ زمین و آسمان میں ٹھہر سکتی ہے اور نہ وہ ظاہری اور باطنی چیزوں میں سنتوں اور فرضوں کی طرح سما سکتی ہے۔

18- اور جس نے یہ دعویٰ کیا کہ میں نے اس کو حقیقتاً پہچان لیا ہے۔ اس نے اپنے وجود کو معروف کے وجود سے بھی زیادہ عظیم اور بزرگ تر کر دیا ہے، کیونکہ جو شخص کسی چیز کو اس کی حقیقت کی تہہ تک پہنچ کر پہچان لیتا ہے وہ دراصل اس چیز سے بھی زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔

19- اے مخاطب، اس کائنات میں سب سے زیادہ حقیر چیز ایک ذرہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تو اس کا بھی ادراک نہیں کرسکتا ہے۔ پس وہ شخص جو ایک ذرہ کو بھی نہیں پہچان سکتا ہے، کس طرح اس ذات کی معرفت کما حقہ حاصل کرسکتا ہے۔ جس کا پہچاننا تمام چیزوں سے کہیں زیادہ مشکل اور دشوار ہے۔

لہٰذا عارف وہ ہے جو دیکھتا ہے اور معرفت کے ذریعے بقا حاصل کرتا ہے اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ معرفت ایک قطعی دلیل کے ذریعے سے

ثابت ہے کیونکہ معرفت میں ایک دائرہ ہے جو اس عین کی مانند ہے' جو شگافتہ ہو۔

-20 اور ایک مقید و معدوم کی طرف سے اور اس علم کی وجہ سے جو ذاتی ہو' معرفت کی عین اس کے میم ہویت کی وجہ سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ یعنی حقیقت معرفت مقام معرفت میں گم ہو جاتی ہے۔ عین' حقیقت اور ذات کو محل اور مقام کہتے ہیں۔ پس ایک مقید و معدوم کی رسائی اور اس کے علم کی پہنچ وہاں تک نہیں ہوسکتی وہ اس سے الگ تھلگ ہوتی ہے اور واردات قلبی کے سبب اس سے جدا رہتی ہے۔ وہ دور ہونے والی بھی ہے اور قریب ہونے والی بھی ہے۔

اس کی طرف رغبت کرنے والا اس سے ڈرنے والا ہوتا ہے اور اس سے ڈرنے والا اس سے جدا ہونے والا ہوتا ہے۔ اس سے چھپنے والا اس کے سامنے آنے والا' اور اس کے سامنے آنے والا اس سے چھپنے والا ہوتا ہے اس کے اوپر کوئی بلند چیز نہیں ہے۔ اسی طرح اس کے نیچے کوئی پست چیز بھی نہیں ہے۔

-21 معرفت مخلوقات سے جدا ہونے والی ہوتی ہے۔ کیونکہ مخلوقات حادث ہیں' ان کو ہمیشگی اور دوام حاصل نہیں ہے۔ اس کے برعکس معرفت ہمیشگی کے ساتھ رہنے والی ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے تمام راستے بند ہیں اور کوئی سبیل اس کی طرف نہیں ہے پھر بھی اس کے تمام مطالب اور معانی واضح ہیں جن کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ معرفت ایک ایسی چیز ہے جس کا ادراک انسانی حواس نہیں کرسکتے ہیں اور جس کے ساتھ لوگوں کے اوصاف بھی وابستہ نہیں ہوسکتے ہیں۔

-22 معرفت والا اکیلا ہوتا ہے۔ اس کا اختیار کرنے والا اس کا منحرف ہوتا ہے۔ اس کی طلب والا درد میں مبتلا رہتا ہے۔ اس سے وابستہ رہنے

والا اپنی متاع ہستی کو گم کرنے والا ہوتا ہے۔ اس کا ظاہر کرنے والا قائم رہنے والا ہوتا ہے۔ اس سے ڈرنے والا پرہیزگار ہوتا ہے اس سے آنکھ بند کرنے والا اس کی نظریں رکھنے والا ہوتا ہے۔ معرفت کی رسیاں یعنی اس کے وسیلے اس کو تھامنے والے اور اس کے اسباب ہوتے ہیں۔

-23 پس معرفت بھی ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح وہ ہے اور معرفت بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ وہ خود ہے اور جیسے وہ اپنی ذات سے ہے۔ معرفت بھی ویسی ہی ہے جیسی وہ خود ہے اور معروف بھی ویسا ہی ہے جیسا وہ خود ہے' گویا کہ معروف معرفت ہے اور معرفت معروف ہے۔ معروف خود اپنی مثال ہے اور معرف بھی خود اپنی مثال ہے۔ مقام "ھی" اور مقام "ھ" کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ ہم "کانہا" اور "کانہ" ہی کہہ سکتے ہیں۔

معرفت کی بنیادیں اس کے ارکان ہیں اور اس کے ارکان اس کی بنیادیں' ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا ہے جو اس کے ہیں وہ اسی کے ہیں وہ پھر کسی اور کے نہیں ہوسکتے۔ معرفت کی بنیاد خود اسی سے قائم ہے اسی کے لیے اور اس کے ذریعے سے ہے۔

یہ "وہ" ہے "وہ" "یہ" ہے۔ یعنی معرفت معروف ہے اور معروف معرفت ہے یہ مقام یکتائی ہے یہاں دوئی مٹ جاتی ہے۔ معرفت معروف کے لباس میں اور معروف معرفت کے پردے میں جلوہ گر ہے۔ ہم صفت کو موصوف سے' موصوف کو صفت سے' معرفت کو معروف سے' معروف کو معرفت سے اور قدرت کو قادر سے اور قادر کو قدرت سے الگ نہیں کرسکتے ہیں۔ اسی مقام کو لاھوالاھو کہتے ہیں۔

-24 پس عارف وہ ہے جو دیکھتا ہے۔ معرف وہ ذات ہے جس کے ذریعے وہ بقا حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا عارف دوسرے لفظوں میں اس ذات

پاک کے عرفان ہی کا نام ہے۔ کیونکہ عرفان کے بغیر اس کا وجود باقی نہیں رہتا ہے۔ وہ غور کرے تو خود اس کا وجود' وجود مطلق کے عرفان کی جیتی جاگتی دلیل ہے۔

25- معرفت کے بارے میں اس کے علاوہ جتنی باتیں بھی ہیں وہ سب افسانہ گو لوگوں کے ذہن کی اختراع ہیں۔ اگر لوگوں کے طبقات کو سامنے رکھا جائے تو معرفت محض خواص کے حصے میں آتی ہے۔ عام لوگوں کی فکر اس کے بارے میں انتشار کا شکار ہے۔ اس کے بارے میں جو لوگ رائے زنی کرتے ہیں اور قلیل و قال کے ذریعے مجلس آرائی کرتے ہیں وہ وسوسوں میں مبتلا ہیں اور جو لوگ اس بارے میں سوچ بچار کے عادی ہیں انہیں مایوسی نے گھیر رکھا ہے۔ جن کو اس کے مسائل سے وحشت ہوتی ہے۔ وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

26- بات یہ ہے کہ حق' حق ہے اور مخلوق مخلوق ہے۔ اس کو جوں کا توں تسلیم کرلینا چاہیے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

دعویٰ انا الحق طاسین الصفا میں اس طرح ہے: وہ طور پر درخت کی جانب سے جو آواز موسیٰ علیہ السلام نے سنی وہ درخت سے نہیں بلکہ حق تعالیٰ نے سنی۔ میری مثال بھی اسی درخت کی طرح ہے یہ کلام بھی اسی کا ہے۔ "پھر طاسین الازل والالتباس میں اس طرح مذکور ہے کہ "میں نے کہا کہ اگر تم اس کو نہیں پہچانتے ہو تو اس کے اثر اور نشان ہی کو پہچان لو اور وہ اثر اور نشان میں ہوں اور میں حق ہوں (اناء الحق) اس لیے کہ میں ہمیشہ فی الواقع حق کے ساتھ رہا ہوں۔

مولانا ظفر علی خان نے طواسین حلاج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسئلہ آفرینش کائنات کی لم فلسفیوں نے تو یہ بتائی ہے کہ اول اول بجز ایک ہیولائی مادے کے غیر منتہی تودے کے اور کچھ نہ تھا جس کے اجزائے لا یتجزیٰ میں جذب و دفع'

اصوق و پیوستگی' جمود و حرکت' برودت و حرارت' لطافت و کثافت' بالیدگی و کاہیدگی' رتق و فتق کی متضاد مگر لازم و ملزوم قوتیں موجود تھیں۔ اپنے وقت پر یہ قوتیں بروئے کار آئیں اور مادہ ہیولایہ اولیہ صورت پذیر ہو کر عوالم و شموس و اقمار و ثوابت و نجوم و معیار کے نظامات کی شکل میں نمودار ہو گیا اور ان گنت زمانوں کے گزرنے کے بعد اس کی ہیت کذائیہ ہوگئی جو اب نظر آتی ہے۔

فلسفہ کے ان حقائق عمومی پر وہ ام الکتاب بھی جس پر ہمارا ایمان ہے کم از کم ایک آیت نیرہ سے روشنی ڈالتی ہے۔ سورۃ الانبیاء میں ہے:

اولم یر الذین کفروان السموات والارض کانتا و تقا ففتقنا عماو جعلنا من الماء کل شیئی حتی افلا یومنون

یعنی وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے جو ناسپاس و ناشکر گزار ہیں۔ جو خدا کی خدائی کو نہیں مانتے۔ کیا وہ یہ نہیں دیکھتے۔ کیا انہیں اس پر غور کرنے کی فرصت نہیں ہے کہ آسمان اور زمین پر سب ایک وقت میں ایک ہی تھے۔ ایک گول دائرہ جیسے تھے جنہیں ہم نے جدا جدا کر دیا اور ہر چیز کو ہم ہی نے پانی کی کیفیت سے زندگانی بخشی۔ کیا اس پر بھی وہ ایمان نہیں لاتے؟ تکوین عالم کا ایک تو یہ فلسفہ ہے۔ جس کی شہادت ہمیں نہ صرف آج کل کی ترقی یافتہ درایت بلکہ خود اپنی مقدس دیرینہ روایت حتیٰ کہ قرآن کی آیت سے ملتی ہے لیکن حضرات متصوفین کے لیے علوم جدیدہ اور معارف قرآنیہ کافی نہیں انہوں نے ایک نیا فلسفہ ایجاد کیا ہے اور زمین و آسمان' آفتاب و ماہتاب' حجر و شجر اور حیوان و بشر کی آفرینش کی ایک انوکھی وجہ تصنیف کی ہے جسے چند لفظوں میں اس مشہور جملہ کے ذریعہ سے ظاہر کیا جاسکتا ہے کہ بطریق معتاد اسے جناب باری کے منہ سے نسبت دے دی گئی۔

کنت کنزا مخفیا" فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق

یعنی خدا فرماتا ہے کہ میں ایک گنج مستور تھا۔ ایک پوشیدہ خزانہ تھا میرا جی

چاہا کہ میری معرفت عام ہو۔ میں روشناس ہو جاؤں۔ اس بنا پر میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔

اس ذوق خود آرائی کی عنصری مثال کو پیش نظر رکھ کر کسی عروس خودبین کو آئینہ کے سامنے گھنٹوں اپنے ہی جمال کے نظارہ پر مجبور کیا کرتا ہے ان بزرگواروں نے خدا کو بھی ایک معشوق سمجھ لیا ہے جس نے اپنے حسن لایزالی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے یہ کائنات بنائی جو گویا ایک آئینہ ہے کہ اس میں اسے اپنی صورت نظر آ رہی ہے' غرض دنیا کیا ہے اچھا خاصا بچوں کا کھیل ہے' بھان متی کا تماشا ہے۔ پتلیوں کا ناچ ہے' نظری آفرینش کائنات کے یہ صوفی پروفیسر قرآن مجید کو کھول کر دیکھتے اور سورۃ الانبیاء کی تلاوت کرتے اور ان آیات پر غور کرنے کی انہیں توفیق عطا ہوتی۔

"ہم نے آسمان کو' زمین کو' آسمان و زمین کی درمیانی خلقت کو کھیل تماشے کے لیے نہیں پیدا کیا ہے۔ اگر ہم لہو و لعب ہی کرنا چاہتے تو وہ کچھ کرتے جو ہماری قدرت و عظمت کے شایان شان ہوتا۔ جو ہم کو زیب دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم باطل کے سر پر حق کو دے مارتے ہیں دونوں کو ٹکرا دیتے ہیں۔ حق اسے چکنا چور کر دیتا ہے' پاش پاش کر ڈالتا ہے اور وہ ایک ایک مٹتا ہوا نظر آتا ہے اور تم پر عذاب ہو۔ تم کیسی توصیف کر رہے ہو۔ کیسی کیفیت بیان کرتے ہو۔" ان آیات کریمہ سے صاف نظر آتا ہے کہ کائنات کو جناب باری نے کس لیے پیدا کیا ہے اور اس پیدائش میں اس نے کیا حکمت رکھی ہے۔ یہ حکمت دو لفظوں میں بیان کر دی گئی ہے کہ دنیا حق و باطل کی رزمگاہ ہے لیکن متصوفین حق و باطل کی جاں کاہ بحث کو چھوڑ کر لہو و لعب کی زیادہ تر دلکش داستان چھیڑ دیتے ہیں اور ہم یقین دلانا چاہتے ہیں کہ: "منصور حلاج اس بازی گرانہ تصوف کا ایک بہت بڑا شارح ہے۔ وہ اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ انسان کا جوہر خدا ہے۔ خدا نے آدم کو اپنی صورت میں پیدا کیا۔ آدم اس کے ازلی و ابدی عشق کی تصویر ہے۔ اپنی ذات سے اس نے اس

تصویر کا عکس ڈالا کہ یہ عکس اس کے لیے بمنزلہ ایک آئینہ کے ہو اور اس آئینہ میں وہ اپنی صورت دیکھا کرے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے فرشتوں کو آدم کی پرستش کا حکم دیا کہ آدم اور مسیح دونوں میں وہ متجسم ہو کر دنیا میں رونما ہوا۔ انسانیت اور ربوبیت کے لیے منصور نے ناسوت اور لاہوت کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ خدا کا ناسوت انسان کی کل بدنی اور روحانی فطرت میں شامل ہے لہٰذا خدا کا لاہوت اس فطرت کے ساتھ صرف بطریق تجسیم یا علی سبیل حلول ہی متحد ہو سکتا ہے۔ خدا اور انسان کو اس طور پر مشترک فی الذات و الصفات ثابت کر کے منصور کوچہ انا الحق کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور کہتا ہے:

"تیری روح میری روح میں اس طرح گھل مل گئی ہے جس طرح شراب میں آپ مطفے۔"

"جب کوئی چیز تجھے چھوتی ہے تو وہ مجھے بھی چھوتی ہے اے خدا ہر حال میں تو وہ ہے جو میں ہوں۔"

"میں وہی خدا ہوں جو میرا محبوب ہے اور وہ جو میرا محبوب ہے وہ خود میں ہوں۔ ہم دو روحیں ہیں۔ جو ایک ہی جسم میں ہیں۔"

"اے کہ تو مجھے دیکھتا ہے۔ جان لے کہ تو اس کو بھی دیکھتا ہے اور اگر تو اس کو دیکھتا ہے تو یقین مان کہ تو ہم دونوں کو دیکھتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ مسلمان ان مشرکانہ عقائد سے سخت بیزار ہیں اور منصور کے یہ عقائد اس کے قتل کے بعد اس کے مریدوں کی طرف ایک خاص جماعت کا دستور العمل بنے رہے لیکن حکومت کے مقابلہ میں اس کی مظلومی اس کے آڑے آ گئی اور آنے والی اسلامی نسلوں نے شاعروں اور صوفیوں کی مدد سے اس کی تعلیم پر پردہ ڈالنے اور اسے طریقت کا شیخ الشیوخ ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ حسین

بن منصور حلاج کے تصوف کی بینات اصلیہ خود انہی کی تصنیف (کتاب الطواسین) میں آتی ہے۔ قرآن حکیم ابلیس کو ملعون کہتا ہے۔ خدا اس کو مردود کہتا ہے۔ اسلام اسے خبث و شر کی صورت مثالیہ مانتا ہے۔ مگر منصور کا تصوف اسی ابلیس کے مناقب و محامد میں رطب اللسان ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار میں ایسے ایسے دلائل پیش کرتا ہے جس سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ ابلیس اس انکار میں بر سرحق تھا اور شریعت بر سر باطل ہے۔

ماسینون لکھتا ہے کہ "اناء الحق" ایک نعرہ مستانہ نہیں تھا بلکہ حلاج نے یہ جملہ بڑے غور و خوض کے بعد سپرد قلم کیا تھا اور اس جملہ میں حلاجی فلسفہ اسی طرح مضمر ہے جس طرح اسلام کے کلمہ توحید میں۔ حلاج کا یہ فکری نظام بڑے ندرت فکر کا حامل ہے اور اس کا صوفیاء مابعد کے خیالات و اذہان پر بڑا گہرا اثر مرتب ہوا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے مخالفین نے اس کو مصلوب کر کے اس کی راکھ بھی ہوا میں اڑا دی مگر وہ اس کے خیالات کو اور اس کے ان دو لفظوں کو دنیا سے اور دنیا والوں کے ذہنوں سے نہ مٹا سکے۔ اناء الحق کی صدائے بازگشت آج بھی سنی جاسکتی ہے۔ ماسینون نے اناء الحق کا ترجمہ الحق الخلاق (The Creative Truth) کیا ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"اگرچہ حلاج خدا کی ورایت کا قائل ہے تاہم وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ خدا کی ذات' انسان کی رسائی سے بالاتر ہے۔ قدیم یہودی اور نصرانی روایت ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا' حلاج نے تخلیق کا وہ عقیدہ مستنبط کیا جس کی مثل بے نظیر عقیدہ تالیہ (Deification) میں موجود تھی۔ جو انسان الوہیت کے مرتبے کو پہنچ جاتا ہے۔ وہ زہد کی بدولت' صورت ایزدی کی اس حقیقت کو' جو خدا نے اس پر منقش کر دی ہے' اپنے باطن میں دیکھ لیتا ہے۔ ہمارے پاس حلاج کی ایسی کئی تحریریں ہیں جن کی بدولت ہمیں اس بات میں کوئی شک نہیں ہے۔ چنانچہ ایک جگہ حلاج لکھتا ہے۔ "تمام اشیاء کی تخلیق سے پہلے بلکہ عالم تخلیق سے بھی پہلے' خدا

اپنی حالت وحدت میں' اپنے ساتھ ناقابل بیان طریقے سے مصروف گفتگو تھا' اور بخود' درخود' اپنی ذات کی عظمت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کی اس تحسین خویش کی خالص سادگی کا دوسرا نام عشق یا محبت ہے جو اس کی اپنی ذات کے اعتبار سے' ذات کی ذات ہے اور جو صفات کی تمام تحدید سے وراء ہے۔ خلاصہ کلام اینکہ اپنی خلوت کاملہ میں خدا اپنی ذات پر عاشق ہے' اپنی حمد و ثناء کرتا ہے اور عشق کے ذریعے سے اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ ذات مطلق میں عشق کے ظہور اولین نے اسماء و صفات ایزدی کی کثرت کو متعین کیا۔ اس کے بعد خدا نے بخود درخود' اپنی ذات سے اپنی اس مسرت عظمیٰ کو--- اس عشق درخلوت کو' خارجی وجود عطا کیا تاکہ وہ اسے دیکھ سکے اور اس سے دوبدو گفتگو کرسکے۔ اس نے اپنے آپ کو آئینہ سرمدیت میں دیکھا اور عدم سے اپنا عکس یا نقش (Image) پیدا کیا۔ پھر اسے اپنے اسماء اور اپنی صفات عطا کیں جس آدم علیہ السلام کے نقش کو خدا کا ابدی نقش بنا دیا۔ خدا نے صورت آدم علیہ السلام پر (جو اس کی صورت تھی) اپنا سلام بھیجا' اس کی ثناء کی' اسے مجتبیٰ بنایا اور اس لحاظ سے کہ اس نے صورت آدم علیہ السلام میں اور اس کے ذریعے سے اپنے آپ کو ظاہر کیا' وہ صورت مخلوق ھو ھو (اللہ) بن گئی۔ حلاج نے ان اشعار میں آدم علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا ہے: "پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی انسانیت (ناسوت) میں اپنی شعاع کستر الوہیت (لاہوت) کا راز ظاہر کیا۔ پھر وہ اپنی مخلوقات پر ایک کھانے اور پینے والے شخص کی شکل میں ظاہر ہوا۔" ان شعروں میں خدا کی دو ذاتوں کا ذکر ہے اور اسی عقیدے کی تعلیم دی گئی ہے۔ خدا میں تو ایک خدائی ذات (لاہوت) ہے' دوسری انسانی ذات (ناسوت) ہے لاہوت اور ناسوت کی یہ اصطلاحیں' حلاج نے سریانی نصرانیت سے مستعار لی ہیں۔ مزید برآں یہ کہ حلاج نے لاہوت اور ناسوت (بقول حلاج خدائی روح اور انسانی روح) کے اتحاد کے لیے حلول کی اصطلاح استعمال کی ہے اور یہ اصطلاح مسلمانوں کے ذہنوں میں نصرانیوں کے عقیدہ تجسم مسیح علیہ

السلام سے وابستہ ہے۔ ان کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ حلاج کی نظموں میں اس کی روح اور خدا کی روح دونوں عاشقوں کی طرح سرگرم راز و ایاز نظر آتی ہیں:

"اے خدا! تیری روح میری روح سے اس طرح ممزوج ہو گئی ہے جس طرح شراب خالص پانی میں مل جاتی ہے۔ جب کوئی شی تجھے مس کرتی ہے تو گویا مجھے مس کرتی ہے۔ کیا تماشا ہے کہ ہر حال میں، تو میں ہے۔"

دوسری نظم میں کہتا ہے:

"میں وہی ہوں جسے میں چاہتا ہوں اور جس سے میں محبت کرتا ہوں وہ میں ہے۔ ہم دونوں دو روحیں ہیں جو ایک بدن میں رہتی ہیں۔ اے مخاطب! اگر تو مجھے دیکھتا ہے تو اسے دیکھتا ہے اور اگر تو اسے دیکھتا ہے تو گویا ہم دونوں کو دیکھتا ہے۔"

حلاج نے فرعون اور ابلیس کو بھی موحد اعظم قرار دیا ہے چنانچہ لکھتا ہے کہ جب خدا نے ابلیس کو ڈرایا کہ اگر تو آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کرے گا تو میں تجھے جہنم میں ڈال دوں گا تو ابلیس نے کہا اے خدا کیا سزا دیتے وقت تو مجھے سزا پاتے ہوئے نہیں دیکھے گا؟ خدا نے اثبات میں جواب دیا تو ابلیس نے کہا پھر میں تجھے دیکھنے میں ایسا محو ہو جاؤں گا کہ مجھے عذاب کا احساس ہی نہ ہوگا۔ دوسرے مکالمے میں جب موسیٰ علیہ السلام نے ابلیس کو سرزنش کی تو اس نے کہا۔ "اے موسیٰ! تمہیں نہیں معلوم، وہ امر نہیں تھا بلکہ میرا امتحان تھا۔" چنانچہ ابلیس خدا سے کہتا ہے۔ "تیری نافرمانی میں میں نے تیری تقدیس کی"۔ دوسری جگہ حلاج اپنے مخالفین سے کہتا ہے: "اگر تم خدا کو نہیں پہچانتے تو کم از کم اس کی آیات کو تو پہچانو۔ میں وہ آیت ہوں میں الحق الخلاق (The Crative Truth) ہوں کیونکہ حق کے واسطے میں بھی ازلی حق ہوں۔ ابلیس اور فرعون میرے معلم ہیں۔ ابلیس کو خدا نے

نار جہنم سے ڈرایا مگر اس نے توبہ نہیں کی (انکار پر قائم رہا)۔ فرعون غرق ہو گیا مگر اس نے بھی توبہ نہیں کی۔ اسی طرح خواہ مجھے قتل کر دیا جائے، میرے ہاتھ پاؤں قطع کر دیئے جائیں اور مجھے مصلوب کر دیا جائے مگر توبہ نہیں کروں گا۔ (اناالحق کا انکار نہیں کروں گا) لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگرچہ حلاج ابلیس کی فتوت (ذاتی قربانی) کی تعریف کرتا ہے مگر اس رب کی نافرمانی پر اسے سرزنش کرتا ہے۔ ابلیس نے اپنے طرز عمل کے جواز میں یہ بات کہی کہ میرا انکار تو مقدر تھا۔ اگرچہ خدا نے مجھے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا مگر اس کی مشیت یہی تھی کہ میں انکار کروں۔ ورنہ میں ضرور اطاعت حکم کرتا، کیونکہ خدا جس بات کا ارادہ کرتا ہے وہ ضرور وقوع پذیر ہوتی ہے۔ حلاج نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اطاعت تو ایک مقدس فریضہ ہے۔ امر ایک حقیقت ازلی ہے جب کہ مشیت اور اس کے متعلق خدا کا علم دونوں حادث ہیں۔ اس لیے امر کے تحت ہیں اور ان کا مرتبہ کم تر ہے۔ مثلاً نیکی اور بدی دونوں خدا ہی کی مشیت سے سرزد ہوتی ہیں لیکن وہ امر صرف نیکی ہی کا کرتا ہے وہ ہمیں ایک کام کا حکم دیتا ہے اور جانتا ہے کہ ہم اس کو نہیں کر سکتے۔ وہ ارادہ کرتا ہے کہ ہم گناہ یا بدی کریں مگر وہ یہ نہیں ارادہ کرتا کہ ہم اپنے جرم کی بدولت بدی کریں یعنی دیدہ و دانستہ عمداً گناہ کریں۔ لیکن حلاج مسئلہ جبر و اختیار کی مشکل سے بخوبی آگاہ تھا۔ چنانچہ کہتا ہے: خدا نے اسے سمندر میں پھینک دیا، اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور اس سے کہا دیکھو ہوشیار ہو جاؤ مبادا تم پانی میں تر ہو جاؤ۔"

پروفیسر نکلسن اپنی تصنیف صوفیائے اسلام میں لکھتا ہے کہ ابن منصور نے دو لفظوں میں ایک ایسا جملہ اپنی زبان سے ادا کیا جسے اسلام نے معاف تو کر دیا لیکن فراموش نہیں کیا۔ "اناالحق" یعنی میں خدا ہوں۔ اناالحق محض ایک خواب دیکھنے والے جذباتی شخص کا اظہار جذبات نہیں تھا بلکہ ایک ایسا وجدان اور روحانی فارمولا تھا جس پر ایک صوفیانہ دبستان کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ اسلامی تصوف کے

اندرونی زہد اور تصوفانہ رجحانات میں یونانی اثرات کی موجودگی ممکن ہے۔ مثلاً نظریہ معرفت جو مصری صوفی ذوالنون (859ء) نے متعارف کردیا۔ اس کے برعکس خود ذوالنون کا مشہور ہم عصر بایزید ایک ایرانی تھا اور اس ہم عصر میں ایرانی اثر (خاص طور پر شیعہ نظریہ امامت جسے وہ خدا کا ذاتی نائب قرار دیتے تھے) کے تحت بڑی حد تک مندرجہ بالا تصورات تشکیل ہوئے۔ جن میں باقی اثرات بدریج ضم ہوتے گئے۔ بایزید کے "سبحانی" حلاج کے اناالحق اور ابن الفرید کے "اناالحی" وغیرہ ایسے اقوال سے واحدت الوجودیت کا نظریہ ثابت کرنا قرین از قیاس ہے اور غلط ہے۔ جب تک ماورائیت کا نظریہ قائم ہے بھرپور نظریہ حلول وحدایت الوجودیت نہیں بلکہ نظریہ Panentheism ہے۔ یعنی یہ نظریہ کہ سب خدا ہے' نہیں بلکہ یہ نظریہ کہ سب خدا میں موجود ہے اور خدا اس سب سے ماورا ہے۔ علاوہ ازیں تصوفانہ محسوسات کو ایہاتی عقائد سے منطبق کرنا درست نہیں۔ مسلمانوں کے نظریہ کے مطابق خدا اور ولی کے مابین ایک مخفی تعلق یا عہد موجود ہے جو قابل توقیر ہے۔ خواہ وہ شریعت سے متصادم ہی کیوں نہ ہو' لیکن ابھی حلاج کے زمانے میں اولیاء کے لیے اس قدر توقیر پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ خطرے سے محفوظ رہتا۔ جب حلاج کو عدالت میں پیش کیا گیا تو فقہا نے فتویٰ دیا کہ اسے سزاوار ٹھہرایا جائے کیونکہ وہ فریضہ حج کو ضروری فرائض میں شامل نہیں سمجھتا تھا۔ غالباً یہ نظریہ اور الزام' کہ اس کے قرامطیوں کے ساتھ خفیہ تعلقات ہیں جو نو سال بعد مکہ معظمہ پر حملہ آور ہوئے اور حجر اسود اٹھا کر لے گئے اس کی موت کا باعث بنے۔ اناالحق کے علاوہ حلاج پر تین اور الزامات تھے جو سنگین نوعیت کے تھے ورنہ محض اس ایک الزام پر شاید اسے سزائے موت نہ دی جاتی۔ حالانکہ اس کا حلول کا نظریہ بھی مسلمانوں کے لیے قابل اعتراض اور مذمت تھا۔

مولانا رومی نے فرمایا کہ جب حلاج نے اناالحق کہا اور شرع سے آگے نکل گئے تو اہل بصیرت نے اس فعل کو خلاف شرع نہیں سمجھا۔ صرف وہ لوگ جو

بصیرت نہیں رکھتے تھے ان ہی لوگوں نے اس کے خلاف شرع قیاس کیا۔ حقیقت تک رسائی حاصل کرنے والے عارف اور سالکوں کے نزدیک حلاج کا اناء الحق کہنا اس لیے جائز ہے کہ اس کے نزدیک باطن کو ظاہریت پر فوقیت حاصل ہے۔ ابن منصور کو اناالحق کی ماہیت کا علم تھا وہ خدا کی ذات صفات سے باخبر تھے انہیں اناالحق کہتے وقت اس بات کی خبر تھی کہ جو کچھ ہے ذات باری ہے اور میں بھی اس ذات باری کی شعاعوں سے منور ہوں۔

اناالحق کی سب سے دلاویز تشریح عبدالقادر گیلانی نے کی ہے۔

"ایک دن ایک عارف کا مرغ ہوش اس کے پیکر ظاہری سے اڑ کر آسمان پر جا پہنچا جہاں وہ ملائکہ کی صفیں چیر کر آگے نکل گیا۔ وہ ایک شاہین تھا جس کی آنکھوں پر **وخلق الانسان ضعیفا** کا خول چڑھا تھا۔ اسے آسمان پر کوئی شکار نہ ملا اور جب اس نے اپنا شکار رائیت ربی بعینہ دیکھا تو وہ اس پریشانی میں مبتلا ہوگیا کہ کہیں شکار اسے یہ نہ کہہ بیٹھے کہ **انی وجہت وجھی للذی فطر السموت والارض** وہ پھر آسمان سے نیچے اتر آیا تاکہ وہ چیز پائے جو مہیا کی تہہ کے نیچے شعلہ زن آگ سے زیادہ بیش بہا ہو۔ جب اس نے اپنی چشم ہوش کھولی اور اس کے جلوؤں کے سوا کچھ نہ پایا تو وہ واپس آگیا اور اس دنیا اور دوسری دنیا میں اپنے محبوب مطلوب کے سوا کچھ نہ پایا۔ وہ بہت خوش ہوا اور مستی میں پکار اٹھا۔ "اناالحق" وہ ایسی نواؤں میں گا اٹھا جو انسان کو نصیب نہیں اور باغ حیات میں اس طرح زمزمہ پیرا ہوا جو آولاد آدم کو میسر نہیں اور ایسی دھن میں نغمہ سرا ہوا کہ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔۔۔"

ابن عربی نے "اناالحق" کی تشریح تمام تر وحدت الوجود کی روشنی میں کی ہے۔ رومی نے "اناالحق" کہنے والے کو اس لوہے سے تشبیہ دی ہے جسے آگ میں ڈالا جائے۔ اور لوہے کا رنگ آگ کے رنگ میں محو ہو جائے۔ یہ مواصلت بہ اعتبار عرض نہیں بلکہ بہ اعتبار اوصاف ہے۔

امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ حلاج نے جو اناالحق کا دعویٰ کیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ دراصل وجود حق ہے اور اس کے ماسوا جو کچھ ہے عدم و باطل ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "حق کے سوا جو کچھ ہے وہ ہلاک ہونے والا یعنی عدم ہے۔"

شیخ شہاب الدین سہروردی فرماتے ہیں کہ حلاج کا قول اناالحق اور حضرت بایزید بسطامی کا قول سبحانی مااعظم شانی (میں پاک ہوں اور میری شان کس قدر بلند ہے) حق تعالیٰ کا کلام ہے۔ مقام فنا فی اللہ میں حق تعالیٰ ان کی زبان سے کہہ رہا تھا اناالحق (میں حق ہوں)

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اناالحق کا وہ مطلب نہیں ہے جو عام فہم تصور کیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ تخلیقی صداقت ہے۔ اعلیٰ اسلامی تصوف میں وصالی تجربہ کے معنی محدود خودی کا اپنے تشخص کو لامحدود خودی میں محو کر دینا نہیں بلکہ لامحدود کا محدود کی آغوش میں سما جانا ہے۔ وہ حلاج کی انا کے الٰہی پہلو کا بالخصوص اعتراف کرتے ہوئے واضح کرتے ہیں کہ یہ صرف عباداتی تصوف ہی تھا جس نے اس باطنی تجربہ کی وحدت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، جسے قرآن نے تین ذرائع میں سے ایک قرار دیا ہے۔ دوسرے دو ذریعے تاریخ و فطرت ہیں۔ اسلام کی مذہبی زندگی میں اس تجربہ کی ترقی حلاج کے ان مشہور الفاظ میں درجہ کمال کو پہنچی کہ میں خالق حق ہوں حلاج کے ہم عصر اور بعد کے لوگوں نے ان کی وحدت الوجودی کی تشریح کی لیکن فرانسیسی مستشرق موسیو ماسینیون نے حلاج کے جو منتشر اقوال جمع کر کے شائع کیے ہیں ان سے ذرا شبہ باقی نہیں رہتا کہ اس ولی شہید کا مدعا ہرگز حق ماوراء ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس تجربہ کی صحیح تشریح قطرہ کا دریا میں فنا ہونا نہیں بلکہ غیر فانی پیرایہ میں انسانی خودی کے ایک عمیق تر ہستی میں حقیقی و باقی ہونے کا ادراک اور اس کی تائید ہے یہ اعلان تو متکلمین کے خلاف ایک اچھا خاصا چیلنج معلوم ہوتا ہے۔ مذہب کے جدید طالب علموں کی دشواری یہ ہے کہ گو اس قسم کا تجربہ ابتدائی

عوالم میں بالکل معلوم کے مطابق ہوتا ہے لیکن ترقی یافتہ مدارج میں کیف و احساس کی نامعلوم حدود تک پہنچ جاتا ہے۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "جب کسی پر حق کی نمود ہوتی ہے تو اس قوت حال میں اس کے ہاتھ سے، فضل باری سے، ایسی عبارت لکھی جاتی ہے کہ خود تعجب ہوتا ہے اور جب کوئی وہم والا اس کو سنتا ہے تو اس کو نفرت ہوتی ہے اور عقل اس کا ادراک نہیں کر سکتی تب لوگ کہتے ہیں یہ سخن عالی ہے۔ اسی حال میں ایک گروہ اپنے جہل کے باعث منکر ہو جاتا ہے اور دوسرا بھی جہل کی بنا پر اقرار کرتا ہے۔ اس واسطے کہ ان کا اقرار بھی انکار ہی ہوتا ہے۔"

ولیم جیمز لکھتا ہے کہ "...... صاحب حال کی قوت ارادی بالکل معطل ہو جاتی ہے اور اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی اعلیٰ اور زبردست قوت کے تسلط میں ہے، صوفی کی یہ حالت ان حالتوں کے مماثل ہوتی ہے جن میں کسی کے اندر کوئی دوسری شخصیت کار فرما ہوتی ہے یا کوئی نبوت کے انداز کی باتیں کرنے لگتا ہے یا بے ارادہ اس کے قلم سے کوئی تحریر سرزد ہونے لگتی ہے۔" تمام مذاہب کے صوفی اس میں ہم نوا ہیں کہ اس حالت کے بیان کے لیے نہ کوئی زبان ہے اور نہ کوئی فہم کے سانچے جس کو یہ تجربہ ہو اس کے لیے وہ یقینی اور حقیقی ہے لیکن جو اس سے محروم ہو اس کو بتانا اور سمجھنا ناممکن ہے۔"

امام غزالی نفسیات واردات روحانی میں کہتے ہیں کہ حالت مستی میں صوفی کو ماورائے عقل و حس حقائق کا ادراک ایسا ہی براہ راست اور یقینی ہوتا ہے جیسا کہ کوئی شخص ہاتھ سے کسی چیز کو چھو کر اس کے وجود کو حقیقی سمجھتا ہے۔ خلوت میں مجھ پر ایسے حقائق کا انکشاف ہوا جن کا بیان کرنا تو درکنار ان کی طرف اشارہ کرنا بھی ممکن نہیں۔ مجھے یہ یقین ہو گیا کہ صوفیا کا راستہ خدا کا راستہ ہے۔ انتہائی منزل مقصود "کلیتاً" خدا کے اندر جذب ہو جانا ہے اس سے پہلے تمام وجدانات و احوال' راخلے سے قبل، محض دہلیز کی طرح ہیں۔ ابتدا ہی سے عجیب انکشافات شروع ہو

جاتے ہیں۔ مدارج میں ملائکہ اور انبیاء کے ارواح نظر آنے لگتے ہیں۔ صوفیاء ان کی آوازیں سنتے ہیں اور ان سے برکات حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد روح صورتوں کے ادراک کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی ہے اور ایسی حالت میں پہنچ جاتی ہے جو بیان میں نہیں آ سکتی۔ اگر کوئی شخص بیان کرنے کی کوشش کرے تو لازما" اس کے الفاظ میں کفر و گناہ کا انداز پیدا ہو جائے گا۔"

بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور شطحات میں کہتے ہیں کہ "عرش میں ہوں، کرسی میں ہوں، لوح میں ہوں، قلم میں ہوں، جبریل، میکائیل اور اسرافیل میں ہوں۔ جو شخص حق تعالیٰ میں محو ہو جاتا ہے وہ حق بن جاتا ہے۔"

ابو سعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ "یہ جبہ جو میں نے پہنا ہوا ہے اس میں بھی اللہ کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے۔"

ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ "لوگو دوزخ باوجود اس قدر آگ رکھنے کے میرے بدن کا ایک بال بھی جلا دے تو میرے مشرک ہونے میں کوئی شک نہیں۔"

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ "پس بعض مشائخ کے اقوال جو بظاہر شریعت حقہ کے مخالف معلوم ہوتے ہیں اور بعض لوگ انہیں توحید وجودی پر محمول کرتے ہیں جیسے ابن منصور حلاج کا نعرہ "انا الحق" اور ابویزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا "سبحانی" کہنا اور اسی طرح کے اور اقوال اولیٰ و انسب۔ انہیں توحید شہودی پر محمول اور عقل و شرع کے ساتھ مخالفت کو دور کیا جائے۔ چونکہ غلبہ حال میں ماسوئی حق سبحانہ کے ہر شے ان کی نظر سے پوشیدہ تھی تو ایسے الفاظ صادر ہو گئے۔ انا الحق کا معنی ہے "حق ہے میں نہیں ہوں" اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ بزرگ اپنے آپ کو دیکھتا ہے اور خود اپنے کو حق کہتا ہے۔ یہ مفہوم تو صریحی کفر ہے۔

سرمد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

سرمد در دین عجب شکستے کردی
ایمان بہ فدائے چشم مستے کردی

عمر یکہ سے کہ آیات و احادیث گذشت
رفتی و نثار بت پرستے کردی

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

من خرق گرد کردم عریان خرابم
خوردم ہمہ رخت خود مہمان خرا باتم

من مرغ لاہوتی بدم دیدم کہ ناسوتی شدم
دامش بدیدم ناگہے دروے گرفتار آمدم
ماست و خراب از مئے معشوق الیستم
زاں مست الستیم کہ معشوق پرستیم

خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ

ایں خرقہ کہ من دارم دررہن شراب اولیٰ
دین دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ
چوں سپرشدی حافظ از میکدہ بیرون رو
رندی و ہوسناکی در عہد شباب اولیٰ

عراقی لکھتے ہیں

رہ قلندر سزد ار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

در خرابات مناں نور خدامے بینم
دیں عجب میں کہ چہ نورے نہ کجامے بینم

حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

آستیں بررخ کشیدہ ہمچو مکار آمدی

باخودی خود در تماشہ سوئے باراز آمدی
شور منصور از کجا و دار منصور از کجا
خود زدی بانگ اناالحق برسردار آمدی

حضرت احمد جام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

من شاہباز قدسم از لا مکاں پریدہ
بہر شکار صیدے در قالب آرمیدہ
احمد نیم کہ آویم از جراچہ گویم
مارا کجا شناسد آن را کہ نیست دیدہ

پروفیسر آر میری لکھتے ہیں کہ:

"اسلامی تصوف کی بنیاد قرآن ہے جس کی ہر وقت تلاوت ہو رہی ہے اور جس پر ہر وقت عمل ہو رہا ہے یہاں تک کہ شطیحات اناالحق وغیرہ جیسے بظاہر غیر شرع کلمات بھی قرآن سے ثابت ہیں جب کہ صوفیاء ذات حق میں فنا ہو کر بعینہٖ واحد متکلم میں کلام کرتے ہیں۔

شاہ نیاز رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

من پاکباز عشقم ذوق فنا چشیدہ
آہوئے دشت ہویم از ماسوئی رمیدہ

معینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

من نمے گویم اناالحق یار میگوید بگو
چونگوئم چوں مرا دلدار میگوید بگو

نظامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

سنگ باب میکدہ را سجدہ گاہے ساختم
قبلہ ایمان و دین جادو نگاہے ساختم

ہر طرف صوم و صلواۃ الوداع سجدہ سجود
میکشی خوباں پرستی عزو جاہے ساختم

حضرت سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

ساقیا مے وہ کہ ما درد کش میخانہ ایم
ماخرابات آشنا واز خرد بیگانہ ایم

شاہ نیاز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

من اک نورم کہ اندر لامکاں موجود بودستم
بہ اتسراق خود شاہد و مشہود بودستم

مست گشتم از دو چشم ساقی پیاہ نوش
الفراق اے ننگ و ناموس الوداع اے عقل و ہوش
دی بدم من شیخ دین و بجہ خوان مسجد نشین
ہستم اکنوں بت پرست و کافر و زنار پوش

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

من نداتم بادہ ام یا بادہ را پیانہ ام
عاشق شواہدہ ام یا عشق یا جانانہ ام
اے امین برمستیم نام تجدد تہمت است
در ازل پیش از زماں تعمیر شدہ میخانہ ام

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اگرچہ بے خودو مستم و بے ہوشیار مے گردم
بباطن شاہ کونین ام بظاہر خوار مے گردم

حضرت قدسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

من لذت درد توبہ درماں نفروشم

کفر سر زلف توبہ ایمان نفروشم

احمد جام کہتے ہیں

ماجملہ بصورت خدائیم
در صورت خود خدا نمائیم

مغربی لکھتے ہیں۔

ہر سو کہ دویدیم ہمہ روئے تو دیدیم
ہر جا کہ رسیدیم سر کوئے تو دیدیم

شاہ بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

روم در بتکدہ شینم بہ پیش بت کنم سجدہ
اگر یابم خریدارے فروشم دین و ایمانم
شرف زنار و تسبیحت یکے شد
تو خواہی خواجہ شو خواہی غلامے

بشکل شیخ دیدم مصطفیٰ را
ندیدم مصطفیٰ بل خدا را
زخود فانی شدم دیدم بقا را
ندیدیم غیر ذات خود خدا را

حضرت ملا شاہ بدخشی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں

رشتہ تسبیح ما رشتہ زنار رشد
رہ سوئے میخانہ داد' مرشد دانائے ما

فانی کشمیری کہتے ہیں

نیست ما روشن دلاں را حاجت طواف حرم
کلیہ تاریک ما بیت الحرام بس است

حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

سدیا عبث احرام طوف کعبہ مے بندی
روئے یار خود بنگر کعبہ صفا این است

صائب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

ماوائے تو از کعبہ و بت خانہ کدام است
اے خانہ برانداز ترا خانہ کدام است
از کثرت روزن نشود مہر مکرر
اے کج نظراں کعبہ و بت خانہ کدام است
دردیدۂ یکتائی ماحال دوئی نیست
زنار چہ و بحہ صد دانہ کدام است

شاہ نیاز رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں

حسن ہر پری روعکس حسن روئے اوست
رنگ و بوئے گلشن خوبی زرنگ بوے اوست

امیر خسرو کہتے ہیں۔

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

گرفتاری' مقدمہ اور سزا

مذہبی حلقوں کی زبردست مخالفت سے تنگ آ کر حسین بن منصور مشرقی ایران کی عرب نو آبادیوں میں تبلیغ کے لیے چلے گئے اور وہاں 895ء سے 902ء تک اپنی تعلیمات پھیلانے میں مصروف رہے۔ پھر تستر واپس آئے اور معتمد ریاست کی اعانت سے اپنے خاندان کو بغداد لے آئے۔ 902ء میں انہوں نے اپنے چار سو مریدوں کے ساتھ دوسرا حج کیا۔ 905ء میں وہ کشمیر تک ہندوستان اور ترکستان کے طویل سفر پر روانہ ہوئے اور اس سفر کے دوران حالات' تہذیب اور مانویت کا گہرا مطالعہ کیا۔ 907ء میں انہوں نے آخری حج کیا اور بغداد واپس آ گئے۔ اب کی مرتبہ بغداد کی فضا آپ کے لیے کوئی زیادہ سازگار نہ تھی۔ مخالفت عروج پر تھی علمائے دین آپ کو کافر ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ لوگوں کو حد سے زیادہ آپ کے خلاف بھڑکا دیا گیا۔ لوگ آپ کو زچ کرنے کے لیے الٹے سیدھے سوالات کی بوچھاڑ کرتے۔ روایت ہے کہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے جب یہ صورت حال بیان کی گئی تو آپ نے فرمایا "جو شخص خود کو تباہ کرنے پر کمربستہ ہے اسے کون بچا سکتا ہے۔ معلوم نہیں کہ حسین جس چیز پر ازل سے پردہ پڑا ہے اسے اٹھانے کے کیوں درپے ہیں۔" یہ روایت درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ بہت پہلے وفات پا چکے تھے یہ بھی روایت ہے کہ ایک دن حلاج بغداد میں مسجد منصور میں داخل ہوئے اور کہا۔ لوگو آؤ اور مجھ سے ایک خبر سنو' ان گنت لوگ جمع ہوگئے جن میں سے بعض حلاج کے پیرو اور عقیدت مند تھے۔ جب کہ بعض مخالفین تھے اور ان سے نفرت کرتے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "تمہیں خبر ہونی چاہیے کہ خدا نے میرا خون تم پر جائز کیا ہے پس آؤ اور مجھے قتل کر دو۔" لوگ رو پڑے۔ عبدالودود ابن سعید ابن عبدالغنی جو کہ زاہد تھے آگے بڑھے

اور پوچھا۔ "یا شیخ! ہم اس شخص کو کیوں کر قتل کریں جو فقہ کے مطابق نماز پڑھتا ہے' روزے رکھتا ہے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے۔" حلاج نے جواب دیا۔ "کسی کا خون بہانا نماز' روزے یا قرآن کی تلاوت کرنے کی وجہ سے منع نہیں کیا گیا۔ مجھے قتل کرو' تاکہ تمہیں اس کا انعام ملے اور مجھے سکون پس تم خدا کی راہ میں مجاہد ہوگے اور میں شہید۔"

حسین بن منصور کی گرفتاری' مقدمہ کی کارروائی اور سزائے موت کا فیصلہ مقتدر باللہ کے دور میں ہوا۔ المقتدر 282ھ میں پیدا ہوا۔ تاریخ عباسیہ کے مطابق اس کی والدہ کا نام شغب تھا اور وہ رومہ کی باشندہ تھی۔ اپنے اطوار میں انوکھی ہونے کے باعث ترکی اسے غریب کے نام سے پکارتے تھے۔

المقتدر 14 سال کی عمر میں 908ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی معتز نے محمد وزیر اور ابو مثنی قاضی کی ہمراہی میں بغاوت کی لیکن گرفتار ہوئے اور المقتدر نے اس بغاوت میں شریک تمام عالموں اور قاضیوں کو قتل کروا دیا۔ گرفتار ہونے والوں میں قاضی ابو عمر بھی شامل تھا جس نے بعد میں حسین بن منصور کو سزائے موت کا حکم سنایا۔

امام سیوطی لکھتے ہیں کہ المقتدر دانشمند اور صائب الرائے تھا لیکن بے انتہا شہوت زنی اور شراب نوشی میں گرفتار رہتا تھا۔ عورتیں اس پر غالب تھیں بے انتہا فضول خرچ تھا اس نے خواتین کو گراں مایہ نفیس جواہرات سے مالا مال کر دیا اور بعض کو تین تین مثقال وزنی نایاب و قیمتی ہیرے دیئے۔ اس کے پاس انقالیہ' رومی' سوڈانی غلاموں کے علاوہ دس ہزار خصی خوبرو لونڈے بھی تھے۔

حلاج کے فرزند احمد بن حسین سے روایت ہے کہ بصر قسوری کی وجہ سے حلاج اور علی بن عیسیٰ وزیر میں زبردست مخالفت شروع ہوئی۔ اس وزیر کے دور میں حلاج پر زنادقہ کے عقائد منسوب کئے گئے۔ اسے شعبدہ باز اور جادوگر کہا گیا۔ اس کے خلاف یہ بھی کہا گیا کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ وزیر نے بادشاہ سے

ان کے قتل کا حکم حاصل کیا اور پھر ہر روز صبح ایک منادی کرنے والا اس کے عقائد کی تشہیر کرتا اور پھر اس کو تختہ دار پر چڑھا کر ہر روز اتار لیا جاتا۔

ابن ندیم الفہرست میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے ابوالحسن بن سنان کی تحریر میں پڑھا ہے کہ 912ء میں حلاج کی سرگرمیاں رنگ لائیں اور ان کا چرچا ہوا۔ اور یہی چرچا اس کی گرفتاری کی وجہ بنا۔ سلطان نے حلاج کے غلام باس کو لالچ دے کر اس شرط پر رہا کیا کہ وہ حلاج کو گرفتار کروائے گا۔ اس وقت حلاج دشت سوس میں تھا۔ غلام نے سلطان کو صورت حال سے آگاہ کیا اور پھر حلاج کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے قتل کے لیے جو شخص اڑ گیا وہ حامد بن عباس تھا۔ ورنہ سلطان کی خواہش تھی کہ اسے رہا کر دیا جائے۔ کیونکہ ابن منصور نے خود سلطان کے حرم سرا' تمام خدام اور عورتوں کو اپنی دعاؤں اور تعویذ گنڈوں سے متاثر کر لیا تھا۔

حسین بن منصور کی گرفتاری کوئی اتنا معمولی واقعہ نہ تھا جو پوشیدہ رہتا۔ چنانچہ بغداد اور آس پاس کے دور دراز علاقوں میں یہ خبر پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق آپ سے ملاقات کرنے جیل خانہ میں آنے لگے۔ لوگوں نے ابن منصور کو قید میں دیکھا تو دل بھر آیا۔ غم و رنج کی کیفیت سے ابن منصور سے کہنے لگے۔ " اناالحق--- اور من جانب الرحمٰن الرحیم کہنا بند کر دو۔ لاتعلقی کا اظہار کر دو۔ خلیفہ تمہیں چھوڑ دیں گے۔ ابن منصور بولے۔ "لوگو تم کیوں خواہ مخواہ مجھے راہ حق سے ہٹانے کے لیے کوشاں ہو۔ جاؤ تم لوگ اپنا کام کرو۔ میں اپنا کام کرتا ہوں یہی خدا کی رضا ہے تم اپنی ذمہ داریاں نبھاؤ میں اپنا فرض سرانجام دیتا ہوں۔"

روایت ہے کہ ایک رات عقیدت مند جو آپ سے ملنے قید خانے پہنچے تو حیرت زدہ رہ گئے وہاں نہ آپ کا قید خانے والا حصہ تھا۔ نہ ہی آپ تھے انہوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سبھی کی آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت پائی جا رہی تھی۔ تمام رات قید خانے کے نگرانوں اور مریدوں نے اس جستجو میں لگا دی کہ آپ کدھر گئے اور یہ کس انداز سے غیر حاضر ہوئے ہیں کہ ساتھ ہی جگہ کو

بھی لے گئے۔ اگلی صبح پھر حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب ان کی نظروں کے سامنے ابن منصور اپنی جگہ موجود تھے۔ لوگوں نے آپ کو دیکھا تو حیرت سے دریافت کیا حضرت یہ کیا معاملہ ہے۔ رات آپ قید خانے سمیت ہی اوجھل تھے۔ ابن منصور نے کہا ہاں رات حضور اکرم ﷺ نے ہمیں اس قید خانے میں شرف ملاقات بخشا تھا اور آپؐ کی موجودگی میں قید خانہ اپنی حیثیت کھو بیٹھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم قید خانہ سمیت اوجھل تھے۔

ماسینون لکھتا ہے کہ 909ء میں حسین بن منصور ابن داؤد اصفہانی کے فتویٰ پر گرفتار ہوئے لیکن ٹھیک ایک سال بعد قید خانہ سے فرار ہو کر دشت سوس کی طرف چلے گئے لیکن 913ء میں مریدوں سمیت گرفتار ہوئے۔ 914ء میں وزیر ابن عیسیٰ نے ان کے خلاف دائرہ کردہ مقدمے کو ختم کر دیا اور ان کے سب مرید رہا ہو گئے لیکن کچھ بااثر لوگوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب انہیں پھر محل میں نظر بند کر دیا گیا۔ 916ء میں حلاج کے خلاف مقدمہ کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ 24 ذی قعد 309ھ (27 مارچ 922ء) کو عدالت کے فیصلے کے مطابق ان کا سر قلم کر دیا گیا۔ اس واقع کے بعد حلاج کے اکثر پیروکاروں کا بھی یہی انجام ہوا۔

ابن حوقل لکھتے ہیں کہ حسین بن منصور نے شعبدہ دکھا کر وزیروں کی ایک جماعت' حکومت کے عہدیداروں اور افسروں اور عراق و جزیرہ وغیرہ کے حاکموں کو اپنی طرف مائل کر لیا لیکن وہ ایسا پھنس گیا تھا کہ فارس کی طرف واپسی ناممکن ہو گئی تھی اور یہ امید نہ تھی کہ اگر یہاں کے لوگوں کے سامنے آ جائے تو وہ اس کے معتقد ہو جائیں گے۔ بہرحال گرفتار ہوا اور قید ہوا اور بغداد کی دارالحکومت میں تاوقت مرگ قید رہا۔

علامہ ابن جوزی نے صلہ تاریخ طبری میں یہ روایت نقل کی ہے کہ شہر سوس میں حسین بن منصور حلاج کو گرفتار کیا گیا اور ان کے بہت سے خطوط اور رقعے پکڑے گئے جن میں رمزوں کی باتیں لکھی تھیں۔ انہیں بغداد بھیج دیا گیا۔

اور وہ مناری پکارتا جاتا تھا کہ دیکھ لو یہ قرامطیوں کا ایک داعی ہے۔

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ بغداد کی طرف واپسی میں حامد بن عباس وزیر سے یہ بیان کیا گیا کہ حسین بن منصور مردے زندہ کرتا ہے اور جنات اس کے تابع ہیں جو چاہتا ہے وہ اس کے سامنے لا کر رکھ دیتے ہیں اور اس نے خلیفہ کے بہت سے اہلکاروں کو معتقد بنا لیا ہے اور نصر صاحب بھی اس کی طرف مائل ہے اور لوگ بھی، حامد نے خلیفہ مقتدر باللہ سے درخواست کی کہ حلاج اور اس کے پیرو اس کے سپرد کر دیئے جائیں۔ نصر نے اس کی طرف سے مدافعت کی۔ وزیر نے اصرار کیا آخر مقتدر نے حکم دیا کہ حلاج کو وزیر کے سپرد کر دیا جائے۔ حلاج کو مختلف الزامات کے تحت گرفتار کر کے آٹھ سال سات مہینے اور آٹھ دن مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔

ابو عبداللہ بن خفیف بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں حسین بن منصور کو قید خانہ میں ملا۔ جب نماز کا وقت آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ اٹھے ہیں اور ان کی بیڑیاں اتر گئی ہیں۔ انہوں نے وضو کیا اور قید خانے کے ایک کونے کی طرف چلے۔ اس قید خانہ کے وسط میں ایک رومال پڑا تھا۔ ان کے اور رومال کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ رومال ان کی طرف آیا یا وہ رومال کی طرف گئے۔ مجھے اس امر پر تعجب ہوا اور حلاج کو گریاں دیکھ کر میں نے کہا آپ اپنے آپ کو آزاد کیوں نہیں کر لیتے تو انہوں نے کہا میں قید تھوڑا ہی ہوا ہوں۔ تم بتاؤ۔ کہاں جانا چاہتے ہو۔ میں نے کہا نیشا پور۔ انہوں نے کہا کہ اپنی آنکھیں بند کر لیجئے میں نے اپنی آنکھیں بند کیں تو انہوں نے کہا۔ اپنی آنکھیں کھول لیجئے میں نے آنکھیں کھولیں تو میں نیشا پور کے اس محلہ میں تھا جہاں میں آنا چاہتا تھا۔ پھر میں نے کہا کہ جناب! مجھے واپس لے چلیئے۔ تو انہوں نے مجھے واپس لوٹا دیا اور کہا۔ اللہ کی قسم اگر عشاق اس بات پر قسم کھائیں کہ وہ عشق کی وجہ سے مردہ یا مقتول ہیں تو وہ اپنی قسم میں حانث نہ ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو وصال کے بعد ہجر میں مبتلا ہوں تو مر جاتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں وصال نصیب ہو جائے تو ان کو دوبارہ زندگی نصیب

ہو جاتی ہے۔ تم محسنین کو دیار محبوب میں بچھڑا ہوا دیکھو گے۔ جیسے اصحاب کہف بچھڑے پڑے تھے کہ ان کو بیداری کے بعد یہ بھی خبر نہ تھی کہ کتنی مدت تک ہوئے رہے۔ پھر کہا۔ اے ابن خفیف! اب غم محبوب کے کھوئے جانے یا مطلوب کے ضائع ہو جانے کا ہے مگر حق واضح ہے اور خواہشات نفس انسان کو رسوا کرنے الی ہیں۔ جملہ مخلوق خواہشات کی اسیر ہے اور ہر ایک کی طلب اس کے اپنے الات اور ہمت کے مطابق ہے اور ان کے حالات علم غیب میں لکھے ہوئے ہیں۔ یب کی باتیں ان سے پوشیدہ ہیں۔ تمام مخلوق دریاء حیرت میں غرق تھی پھر انہوں نے یہ شعر پڑھے۔

- طالب کا رونا شوق کو بڑھانے کے لیے ہے اور مریض کا رونا طبیب کے مفقود ہونے کی وجہ سے ہے۔
- اس کے طالبوں کا حال اس بارے میں زیادہ سخت ہے کیونکہ وصال مقصود ہے اور محبوب دور ہے۔

پھر انہوں نے کہا اے ابن خفیف میں نے زیارت کا قصد کیا مگر کثرت زائرین وجہ مجھے ایک قدم رکھنے کی جگہ نہ ملی۔ میں حیران و پریشان کھڑا ہو گیا۔ اس نے ری طرف آنکھ جما کر دیکھا۔ میں نے اچانک خود کو اس کے پاس پایا۔ تب اس نے ے کہا کہ جو شخص میری معرفت حاصل کر کے مجھ سے اغراض کرے گا۔ اسے ایسا اب دوں گا جو دونوں جہانوں میں کسی کو نہ دیا گیا ہو گا۔ وہ کہنے لگے۔

عاشق کا تیری محبت میں تکلیف اٹھانا شیریں اور اس کا تجھ سے دور ہونا بھی قریب ہے۔

آپ میرے نزدیک میری روح کی مانند ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔

تو میری آنکھ کی آنکھ ہے اور تو ہی میرے دل کا دل ہے۔

محبت کی وجہ سے میں اس چیز کو زیادہ پیار کرتا ہوں جو تجھے پیاری

ہوتی ہے۔

اس دوران لوگ ان کے پاس جاتے اور ان سے مسائل پوچھتے تھے۔ اس کے بعد لوگوں کو حسین کے پاس آنے سے منع کر دیا گیا۔ پانچ ماہ تک سوائے ابن عطا اور عبداللہ خفیف کے، وہ بھی ایک ایک مرتبہ، کوئی اس کے پاس نہ گیا۔ ایک موقع پر ابن عطا نے انہیں کہلا بھیجا کہ یا شیخ! جو کچھ آپ نے کہا۔ اس کی معذرت کر لیں تاکہ آپ کی رہائی ہو جائے۔ حلاج نے جواب میں کہا کہ جس نے یہ بات (اناالحق) کہی ہے اس سے کہو عذر خواہی کرلے جب ابن عطا نے یہ جواب سنا تو وہ رو دیئے اور بولے کہ ہمارا بھی حسین منصور سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے۔

کہتے ہیں کہ جب انہیں محبوس کیا گیا تو پہلی رات متعلقہ ملازمین ان کو دیکھنے کے لیے گئے۔ وہ قید خانہ میں نظر نہ آئے۔ انہوں نے تمام قید خانہ چھان مارا لیکن وہ کہیں نظر نہ آئے۔ دوسری رات نہ تو وہ نظر آئے اور نہ زندان--- تیسری رات انہوں نے انہیں زندان میں پایا۔ ان سے پوچھا گیا کہ شب اول آپ کہاں تھے اور دوسری رات آپ اور زندان کہاں غائب ہوگئے تھے۔ اب تم دونوں ظاہر ہوگئے ہو۔ یہ کیا واقعہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ پہلی رات میں دربار میں تھا اس لیے یہاں موجود نہ تھا۔ دوسری رات دربار حق یہاں تھا۔ اس لیے ہم دونوں غائب تھے۔ تیسری رات مجھے برائے حفظ شریعت واپس بھیج دیا گیا۔ تم آؤ اور اپنا کام کرو۔

روایت ہے کہ حسین قید خانے میں ایک شب و روز میں ہزار رکعت نماز پڑھتے تھے۔ ان سے کہا گیا۔ "آپ تو کہتے ہیں کہ میں حق ہوں، پھر یہ نماز کس کے لیے پڑھتے ہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔ "ہم اپنی قدر جانتے ہیں۔"

بیان کرتے ہیں کہ اس قید خانہ میں تین سو قیدی اور تھے۔ ایک رات حسین نے ان قیدیوں سے کہا کہ دیکھو ہم تم کو رہائی دلاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ خود کو رہائی کیوں نہیں دلاتے۔ حلاج نے جواب دیا کہ ہم خدا کی قید میں ہیں

اور سلامتی کا خیال رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو ایک اشارے میں سارے بند کھول دیں۔ پھر انہوں نے انگلی سے اشارہ کیا اور تمام بند کھل کر زمین پر آ گئے۔ پھر قیدیوں نے ان سے پوچھا کہ اس وقت قید خانہ کا دروازہ بند ہے ہم کہاں جائیں۔ حسین نے اشارہ کیا جس سے دیوار میں رخنے پڑ گئے۔ تب وہ بولے جاؤ اب اپنی راہ لو۔ انہوں نے کہا کہ کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارا اس (خدا) کے ساتھ ایک راز ہے جسے صرف دار پر ہی کہا جاسکتا ہے۔ دوسرے روز قید خانہ والوں نے پوچھا کہ قیدی کدھر گئے، حسین بولے۔ میں نے انہیں آزاد کر دیا ہے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ خود کیوں نہیں گئے۔ حسین نے کہا حق کا مجھ پر عتاب ہے اس لیے میں نہیں گیا۔ یہ بات خلیفہ تک پہنچ گئی۔ خلیفہ نے کہا کہ یہ کوئی فتنہ کھڑا کرے گا۔ بہتر ہے اسے مار ڈالا جائے یا چھڑی سے پیٹا جائے تاکہ اس قسم کی باتوں سے باز آجائے۔ چنانچہ اسے تین سو چھڑیاں ماری گئیں۔ ہر چھڑی پر ایک فصیح آواز نکلتی۔ "لا تخف یا ابن منصور" (اے ابن منصور مت ڈر) شیخ عبدالجلیل صفار کا کہنا ہے کہ حسین منصور کے حق میں میرے اعتقاد کی نسبت اس چھڑی مارنے والے کے حق میں میرا اعتقاد زیادہ تھا۔ وہ اس لیے کہ شریعت کے معاملے میں خدا جانے اس شخص میں کون سی قوت تھی کہ وہ اس قسم کی واضح آواز سنتا تھا اور اس کا ہاتھ کانپتا تک نہیں تھا اور وہ مارتا جاتا تھا۔

حلاج کا مقدمہ مذہبی، سیاسی اور مالی حکمت عملی کے خلاف سازشوں کے بھیس میں قائم ہوا۔ جنہوں نے کمسن خلیفہ المقتدر کے عہد حکومت میں دربار بغداد میں اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ ان پر مندرجہ ذیل اہم الزامات عائد کئے گئے۔

1- اناالحق کہہ کر خدائی کا دعویٰ کرتا ہے۔

2- حلول کا قائل ہے۔

3- اسلامی عبادات کا مفہوم بدلتا ہے۔

حلاج کے دو بڑے دشمن شیعی وزیر ابن الفرات اور وزیر حامد تھے۔ حلاج کا

شدید تر مطالبہ اور عوام پر اس مطالبے کے اثر نے ارباب اختیار کو ناراض کر دیا۔ حلاج کی تبلیغ سے متاثر ہونے والے قوم کی اخلاقی و سیاسی اصلاح کے لیے بغداد میں ایک تحریک کا آغاز چاہتے تھے۔ جن میں کچھ وزراء بھی شامل تھے۔ ان میں ابن عیسیٰ بھی شامل تھا۔ ابن منصور نے اپنے بہت سے رسائل کا انتساب احمد ہمدانی اور ابن عیسیٰ کے نام پر لکھا تھا۔ خلیفہ المقتدر ست رائے اور متلون مزاج رکھتا تھا۔ ابن عیسیٰ نے جب خلیفہ کو کہا کہ خلیفہ خدا کے سامنے جواب دہ ہے تو وہ ناراض ہوگیا اور ابن عیسیٰ کو معزول کرکے اس کی جگہ ابن الفرات کو وزیر بنا دیا جو عیسیٰ کے ساتھ ساتھ حلاج کا بھی دشمن ہوگیا۔

وزیر حامد کے بارے میں لوئی موسینون لکھتا ہے کہ حلاج کے تمام بدخواہوں کا سرغنہ خلیفہ کا بوڑھا وزیر حامد تھا۔ یہ آدمی مدت سے مستوفی مالیات چلا آ رہا تھا اور اس کام نے اسے اتنا مغرور و مسحور کر دیا تھا کہ اگر سور آمد سے ایک دینار بھی بیت المال میں جاتا تو وہ گمان کرتا گویا اپنی جیب سے دے رہا ہے۔ اس نے اس طرح نیرنگ اور رندانہ ریاکاری کے وسیلے سے بہت سی دولت جمع کرلی تھی اور اس کا بیشتر حصہ لطف و اخلاق سے عاری عیش و عشرت اور زریں کمر و پیراستہ غلاموں کے پہلو میں تباہ کر دیتا۔ حامد اہل سنت میں سے تھا مگر اس کا ایمان پختہ نہ تھا۔ وہ حریص و کوتاہ نظر آدمی اور بیکار سپاہی تھا۔ حلاج کا ہر کام اسے برا دکھائی دیتا تھا۔ اسے نہ روحانیت حلاج اچھی لگتی اور نہ اس کی پارسائی بھاتی۔ وہ نہ حلاج کے انداز آخرت پر کان دھرتا اور نہ ہی اس کی کرامات سے متاثر ہوتا۔ یوں سمجھئے کہ حلاج حامد کی نظر میں ایک ایسا بڑا جادوگر تھا جو ہر رنگ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ بنا بریں اس کا عقیدہ یہ تھا کہ جتنا جلد ممکن ہو جہان کو حلاج کے وجود سے پاک کر دیا جائے۔ دوسرا شخص جو حامد کو حلاج کی مخالفت پر بھڑکاتا تھا۔ شلمغانی تھا وہ حامد کے غالی داماد نے مدد و تعاون کے لیے ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہ رند' پست فطرت' ظالم اور اخلاق نیک سے عاری تھا۔ وہ اپنے سے پست تر حریف ابن روح نوبختی کے چنگل

میں پھنس گیا تھا۔ حامد اس فکر میں رہتا کہ جب روئے زمین وجود حلاج سے پاک ہو جائے گی تو ہوسکتا ہے کہ موت کے بعد اس کا جادو کارگر ہو جائے۔ اسی دوراندیشی کی وجہ سے اس نے کہا تھا کہ حلاج کو اس کی سرکشی کے سبب قتل کر رہا ہوں۔ گویا وہ یہ ذمہ داری کہ حلاج کافر ہے یا نہیں قاضیوں اور گواہوں کے کندھوں پر ڈالنا چاہتا تھا۔ جس میں وہ کامیاب رہا۔

ان دونوں وزراء کے علاوہ کچھ اور درباری بھی حلاج کے خلفا تھے جن میں سپہ سالار مونس رومی تھا۔ یہ سپہ سالار رومی الاصل خواجہ سراؤں میں سے تھا جو تقریباً حامد ہی کی طرح بوڑھا تھا۔ اس وقت تک اس نے منصور کے بارے میں کچھ نہ کہا تھا۔ کیونکہ اس کا منہ بولا بیٹا حسین بن حمدان اور اس کا دوست نصر' جو دربار کے حاجبوں کا سردار تھا حلاج کی پشت پناہی کرتا تھا۔ یہ بوڑھا سپہ سالار سب سے بڑھ کر مطلب پرست شخص تھا۔ خلیفہ المتضد اور اس کے فرزندوں خصوصاً المقتدر کے لیے اس نے حلف وفاداری اٹھایا تھا اور اس قسم کے ساتھ وہ سمجھتا تھا کہ غصب کے مال سے فائدہ اٹھانے اور رشوت لینے کا حق بخششیں و تحفہ کے نام سے اسے دے دیا گیا ہے۔ گویا وہ سب کچھ خلیفہ کی بخشش سمجھتا تھا۔ مونس اس طرح اپنی اور اپنے افسروں کی خوش گذارنی کے اخراجات فراہم کرتا تھا۔ جب ابن عیسیٰ نے خراج میں لوگوں کو چھوٹ دی تھی تو مونس کو یہ بات پسند نہ آئی تھی اور جب ابن عیسیٰ بیرونی سیاست میں نرمی سے کام لے رہا تھا تو مونس کو یہ نرمی بھی نہ بھائی تھی۔ اگرچہ مونس اس وقت تک ابن عیسیٰ کی مدد کرتا رہا لیکن اس کے بعد مقابلہ پر اتر آیا اور حامد کا ساتھی بن گیا۔ مونس کا مقصد یہ تھا کہ نصر کی مخالفت کرکے ابن ابی لساج کو اخ معکوک کو "رے" میں امیر سپاہ بناہ دیا جائے۔ مونس ابن ابی الساج کے ساتھ اپنے عہد و پیان پر قائم تھا۔ اسی وجہ سے اس نے نصر اور خلیفہ کی والدہ کی مخالفت کی اور حلاج کے دوستوں کو درندہ خو وزیر حامد کے چنگل میں پھنسا دیا۔ لیفہ کی والدہ کے ساتھ اس کی یہ کشمکش چند سال بعد 930ء کے انقلاب سیاسی کا

سبب بنی۔ یہ وہی سال تھا جب قرامطی باغیوں نے مکہ معظمہ کو تاراج کیا اور مونس نے بیت المال کو خالی کر دیا۔

وزیر حامد نے ابن عیسیٰ کے اثر کو زائل کرنے کے لیے حلاج پر مذکورہ الزامات کے تحت مقدمہ شروع کیا اور اس سلسلے میں ابن مجاہد نے اس کی مدد کی۔ مقدمے کی سماعت میں کوئی شافی مکتبہ فکر کا قاضی موجود نہ تھا۔ حنفی قاضی نے فیصلہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن قاضی کے معاون ابو عمر اس کی حمایت کرنے پر رضا مند ہو گیا۔ قاضی ابو عمر عیش پرست اور ہوشیار آدمی تھا۔ 930ء کے انقلاب میں اس شخص کی سب سے بڑی آرزو پوری ہوئی یعنی اسے قاضی القضاۃ کا لقب ملا۔ وہ ایک درباری اور سختی سے ہوا کے رخ پر چلنے والا آدمی تھا۔ ہر سانچے میں ڈھل جاتا ۔ اس کی تلون مزاجی مشہور تھی۔ اسے عطریات سے بے نظیر دلچسپی تھی۔ عجیب انداز سے اپنے حکم کے خلاف تازہ حکم صادر کرتا اور اپنے غلط کام کو درست و معقول ثابت کرتا تھا۔ مذہب کے اعتبار سے وہ سنی مالکی تھا۔ مسائل فقہ میں کمزور تھا اور اس کی تلافی وہ حدیث و قیاس اور ظاہری رسم و رواج اور عرف میں مبالغہ سے کام لے کر کرتا تھا اس سبب سے کہ اس نے پوری مہارت کے ساتھ صلاح عام کے نام سے حلاج کے قضیہ دشوار کو اپنی مرضی کے مطابق حل کیا تھا خود کو سربلند سمجھنے لگا۔ گویا وہ یہ کام کر کے اپنی اقران و امثال سے بہت بڑا انتقام لے چکا تھا۔

ابن خفیف بیان کرتے ہیں کہ حامد بن عباس حسین کے بارے میں سوئے ظن رکھتا تھا۔ انہیں وزیر اور قاضی القضاۃ ابو عمر کے سامنے پیش کیا گیا اور پوچھا گیا کہ ہمیں خبر ملی ہے کہ آپ نے کہا ہے کہ جس شخص کے پاس مال ہو۔ وہ اسے غربا پر صدقہ کر دے کیونکہ صدقہ کرنا جمع کرنے سے بہتر ہے۔ حسین نے کہا۔ ہاں میں نے یہ بات کہی ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ بات تم نے کیسے کہہ دی۔ انہوں نے کہا۔" میں نے فلاں کتاب سے لی ہے۔ قاضی نے کہا۔ اے زندیق تم نے جھوٹ بولا ہے جس کتاب کے بارے میں تم نے کہا ہے وہ ہم نے دیکھی ہے۔ اس میں یہ بات

نہیں پائی جاتی۔ تب وزیر نے قاضی کو کہا۔ لکھ دو کہ یہ زندیق ہے۔ تب اس نے قاضی سے فتویٰ لے کر خلیفہ کو بھیج دیا اور خلیفہ نے اس کو پھانسی کا حکم صادر کیا۔ جب انہیں پھانسی دینے کے لیے لے جانے لگے تو انہوں نے ایک صاحب کو بلایا اور کہا کہ جب مجھے جلایا جائے گا تو دجلہ کا پانی چڑھنا شروع ہو جائے گا اور قریب ہو گا کہ پانی بغداد کو غرق کر دے۔ جب تم یہ منظر دیکھو تو میری راکھ لے کر پانی میں ڈال دینا' تاکہ پانی ساکن ہو جائے۔ پھر یہ اشعار پڑھے۔ (ترجمہ)

1- میرے دوستو! مجھے قتل کر دو کیونکہ موت ہی میں میری زندگی ہے۔
2- دنیوی زندگی میں میری موت ہے' میری زندگی تو موت میں ہی ہے۔
3- وہ جو زندہ جاوید ہے اس کی صفات مفقود نہیں ہوتیں۔
4- میں اسی سے تربیت یافتہ ہوں' تربیت کرنے والوں کی گودوں میں پرورش پائی ہے۔

حافظ ابو بکر الخطیب البغدادی لکھتے ہیں کہ وہ صوفیاء کی صحبت میں رہتا تھا اور اپنے آپ کو ان کی طرح منسوب کرتا ہے۔ اس وقت حامد بن عباس وزیر تھا۔ اس کو خبر پہنچی کہ حلاج نے محل شاہی کے حشم و خدم دربانوں اور نصر قشوری حاجب کے غلاموں کو فریب کاری کی یہ باتیں بتائی ہیں کہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ جنات اس کی خدمت کرتے ہیں اور جو چاہتا ہے حاضر کرتے ہیں اور یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ اس نے بہت سے پرندے زندہ کیے ہیں' نیز ابو علی ادارجی نے علی بن عیسیٰ کو مطلع کیا کہ محمد بن علی قنائی جو دربار کے منشیوں میں سے ہے حلاج کی پرستش کرتا ہے اور لوگوں کو اس کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے۔ علی بن عیسیٰ نے محمد بن علی قنائی کا گھر ضبط کرنے اور اسے گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ پھر اس سے اعتراف کرایا اس نے یہ اقرار کیا کہ میں حلاج کے اصحاب میں سے ہوں۔ چنانچہ اس کے گھر سے بہت سے کتابچے اور رقعے ضبط کیے گئے جو حلاج کے لکھے ہوئے تھے۔ حامد عباس نے مقتدر باللہ سے درخواست کی کہ حلاج اور اس کے پیروکاروں کو اس کے

سپرد کا جائے۔ نصر صاحب نے اس بات کو ٹالا اور حلاج کی طرف سے جواب دہی کی، لوگوں میں یہ بات پھیلی ہوئی تھی کہ نصر حاجب حلاج کی طرف مائل ہے تو اب حامد نے بلاواسطہ خلیفہ سے درخواست کی۔ چنانچہ حلاج کو اس کے حوالے کر دیا گیا۔ اس نے سختی کے ساتھ اس کی نگرانی کی۔ ہر روز اس کو اپنی مجلس میں بلاتا اور اس کے عیوب کی تلاش میں رہتا تاکہ اس کے قتل کرنے کا راستہ تلاش کرے۔ مگر حلاج مجلس میں آکر **اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمد رسول الله** کہتے اور سوائے توحید و شرائع اسلام کو ظاہر کرنے کے کچھ نہ کہتے۔ اسی اثنا میں حامد سے کسی مخبر نے کہا کہ بعض لوگ حلاج کی خدائی کا اعتقاد رکھتے ہیں حامد نے ان کو گرفتار کیا۔ ان سے گفتگو کی۔ انہوں نے اقرار کیا کہ ہم حلاج کے اصحاب اور منادی ہیں اور یہ بھی کہا کہ ہمارے نزدیک سچ مچ حلاج خدا ہے۔ مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ حلاج کے سامنے اس بات کا اظہار کیا گیا تو اس نے انکار کیا اور ان کو جھوٹا قرار دیا اور کہا، خدا کی پناہ کہ میں خدائی یا نبوت کا دعویٰ کروں میں تو اللہ کا ایک بندہ ہوں۔ اس کی عبادت کرتا ہوں، نماز، روزہ اور نیک کام کی کثرت کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا۔

حامد کو حلاج کے ایک متبع کی ایک خبر پہنچی کہ وہ اس جگہ پہنچا ہے جہاں حلاج نظر بند ہے۔ اس سے بات چیت کر کے واپس چلا گیا ہے۔ یہ حکم عدولی حامد پر شاق گزری۔ اس نے دربانوں اور چوکیداروں سے دریافت کیا۔ کیونکہ وہ حکم دے چکا تھا کہ اس کے پاس کوئی نہ جائے۔ چنانچہ بعض دربانوں کو مارا پیٹا بھی گیا۔ تو انہوں نے قسمیں کھا کر کہا کہ انہوں نے حلاج کے پاس اس کے کسی مرید کو جانے نہیں دیا۔ نہ ان کے سامنے کوئی گیا ہے، اس کے بعد حامد نے چھتوں اور دیواروں کے گوشوں کا خود معائنہ کیا تو کسی جگہ کوئی نشان یا نقب نہ ملا۔ حلاج سے اس معاملہ کی تحقیق کی تو حسین نے جواب دیا کہ قدرت الٰہی سے وہ یہاں اترا۔ اور جس طرح میرے پاس آیا اسی طرح یہاں سے چلا گیا۔ وزیر حسین بن العباس کے پاس روزانہ

دفتر کے دفتر حلاج کے اصحاب کے گھروں سے لائے جاتے تھے۔ ایک دن اس کے سامنے حلاج کی ایک کتاب پڑھی گئی اس وقت قاضی ابو عمر حاضر تھے۔ اس کتاب کا یہ مضمون تھا۔

> "اگر کوئی شخص حج کا ارادہ رکھتا ہو اور قدرت نہ رکھتا ہو۔ وہ اپنے گھر میں سے ایک کمرہ عبادت کے لیے مخصوص کرے اور اس کو پاس صاف رکھے، کسی قسم کی نجاست وہاں نہ پہنچ سکے۔ نہ اس کے سوا دوسرا اس کمرہ میں داخل ہو۔ سب کو اس کمرہ سے روک دے پھر ایام حج میں اس گھر کا طواف کرے۔ جیسے خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں اور جو مناسک حج مکہ میں ادا کئے جاتے ہیں۔ سب بجا لائے جب ادا کر چکے تو تیس یتامیٰ کو جمع کر کے اس گھر کے سامنے اپنی طاقت کے مطابق کھانا کھلائے اور خود ان کی خدمت کرے۔ تب وہ کھانے سے فارغ ہو کر ہاتھ دھولیں تو ہر ایک کو ایک ایک کرتا پہنائے پھر ہر ایک کو سات درہم یا تین درہم دے۔ یہ عمل اس کے لیے حج کا قائم مقام ہو گا۔"

جس وقت یہ کتاب پڑھی جا رہی تھی تو ابو عمر القاضی حلاج کی طرف متوجہ ہوا اور کہا۔ یہ مضمون تم نے کہاں سے حاصل کیا۔ کہا کہ حسن بصری کی کتاب الاخلاص سے۔ ابو عمر نے کہا۔ اے حلال الدم! تم جھوٹ کہتے ہو۔ ہم نے حسن بصری کی کتاب الاخلاص مکہ میں سنی تھی اس میں تو یہ مضمون نہ تھا۔ جب ابو عمر کی زبان سے "کذبت حلال الدم نکلا تو وزیر حامد نے قاضی ابو عمر سے کہا کہ یہ الفاظ لکھ دیجئے۔ قاضی ابو عمر حلاج سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھ کر اس بات کو ٹالنے لگا۔ مگر حامد نے اس کو نہ چھوڑا۔ وہ برابر ٹالنے اور دوسری باتوں میں لگنے کی سعی کرتے رہے اور احمد اس بات کے لکھنے کا مطالبہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دوات اپنے آگے

سے بڑھا کر قاضی کے سامنے رکھ دی اور کاغذ منگا کر اس کو دیا اور بہت سختی کے ساتھ لکھنے کا مطالبہ کیا' جس کے بعد قاضی مخالفت نہ کرسکا اور ابن منصور کے جواز قتل کا فتویٰ سپرد قلم کر دیا۔ اس کے بعد دوسرے حاضرین نے بھی اپنے دستخط ثبت کر دیئے۔

جب حلاج نے یہ صورت دیکھی تو کہا میری پشت شرعاً" ممنوع ہے۔ مجھے کوڑوں کی سزا نہیں دی جاسکتی اور میرا خون بہانا حرام ہے۔ تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ میرے جواز قتل کا فتویٰ دو۔ حالانکہ میرا اعتقاد اسلام کے موافق ہے۔ میرا مذہب سنت رسول کے مطابق ہے اور میں صدیق اکبر' حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت طلحہ' حضرت زبیر' حضرت سعد و سعید' حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت ابوعبیدہ (جملہ عشرہ و مبشرہ) کی تفصیل کا قائل ہوں اور سنت کے مطابق میری کتابیں' کتب فروشوں کے پاس ہیں پس میرے خون کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ وہ اس بات کو دہراتے رہے تاوقتیکہ لوگ مجلس سے اٹھ کر چلے گئے۔

حامد نے محضر نامہ زنجی کے سپرد کیا کہ اس کو خلیفہ مقتدر باللہ تک پہنچا کر مجلس علماء کا سارا حال اس کے گوش گزار کرے اور خلیفہ سے اس کا جواب جلد حاصل کرکے مطلع کرے۔ زنجی نے خلیفہ کے نام دو رقعے لکھے اور فتویٰ علماء کو ان کے اندر رکھ کر بھیج دیا۔ خلیفہ سے دو دن تک کچھ جواب نہ آیا۔ تو حامد سخت پریشان ہوا۔ اپنی اس حرکت پر نادم ہوا کہ ایسا نہ ہو خلیفہ کے نزدیک میری یہ کارروائی بے موقع سمجھی گئی ہو لیکن جس کارروائی کا وہ آغاز کرچکا تھا اس کو انتہا تک پہنچائے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے تیسرے دن پھر ایک خط خلیفہ کو لکھوایا۔ جس میں پہلے خط کا تقاضا تھا اور یہ بھی لکھا گیا کہ مجلس علماء میں جو کچھ طے پایا ہے اس کی خبر لوگوں میں پھیل چکی ہے اگر اس کے بعد حلاج کو قتل نہ کیا گیا تو لوگ اس کے فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے اور دو آدمی بھی اس کے متعلق اختلاف کرنے والے باقی نہ رہیں گے۔ یہ خط مفلح کے ذریعے خلیفہ کے پاس بھیجا گیا اور اس سے کہا گیا

کہ خلیفہ کو یہ پہنچا کر اس کا جواب لایا جائے۔ چنانچہ اگلے دن مفلح کو جواب صادر ہوا کہ جب قاضیوں نے حسین کے قتل کا فتویٰ دے دیا ہے اور حلال الدم کہہ دیا ہے' تو حسین کو محمد بن عبدالصمد کوتوال کے سپرد کر دیا جائے' کوتوال اس کو اپنی نگرانی میں لے کر ہزار تازیانے لگائے اگر اس سے ہلاک ہو جائے تو بہتر ورنہ اس کی گردن اڑا دی جائے۔

وزیر حامد اس سے بہت خوش ہوا' اور اس کا اضطراب دور ہوگیا۔ اب محمد بن عبدالصمد کو بلا کر خلیفہ کا فرمان پڑھ کر سنایا اور حلاج کو اس کے حوالے کیا گیا۔ اس نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا اور کہا۔ مجھے ڈر ہے کہ حلاج کو مجھ سے چھین لیا جائے گا۔ حامد نے اس کو یقین دلایا کہ میں اپنے غلاموں کو تیری معاونت کے لیے بھیج دوں گا۔ وہ حلاج کو کوتوالی کے جیل خانے تک غربی جانب پہنچا دیں گے پھر سب کے اتفاق سے یہ فیصلہ ہوا کہ کوتوال عشاء کے بعد اپنی جماعت کے ساتھ حاضر ہو۔ جن میں کچھ سائیسوں کی طرح خچروں پر ہوں۔ انہی میں ایک خچر پر حلاج کو سوار کر دیا جائے تاکہ غلاموں کے انبوہ میں اسے کوئی پہچان نہ سکے۔ پھر اس کو حکم دیا کہ حلاج کو ایک ہزار کوڑے لگائے جائیں۔ اگر اس سے ہلاک ہو جائے تو بہتر ورنہ اس کا سر کاٹ کر محفوظ کر لیا جائے اور اس کا جسم نذر آتش کر دیا جائے۔ وزیر حامد نے اس سے کہا۔ اگر وہ تجھ کو دریائے فرات میں سونا چاندی بہتا ہوا دکھا دے تو بھی اس کو قبول نہ کرنا اور مار سے ہاتھ نہ روکنا۔

عشاء کے بعد محمد بن عبدالصمد اپنے آدمیوں اور خچروں کو ساتھ لے کر پہنچا اور حامد نے اپنے غلاموں کو اس کے ہمراہ سوار ہونے کا حکم دیا تاکہ وہ حلاج کو کوتوالی کے میدان تک پہنچا دیں۔ حلاج کی نگرانی پر جو غلام متعین تھا۔ اس کو قید خانہ سے حسین کو باہر لانے اور محمد بن عبدالصمد کے آدمیوں کے حوالے کرنے کا حکم دیا گیا۔ غلام نے یہ شکایت بیان کی کہ جب اس نے حلاج کو کمرہ سے باہر نکالنے کے لیے دروازہ کھولا اور اس کو باہر آنے کو کہا' تو حلاج نے پوچھا کہ وزیر کے پاس

کون ہے۔ اس نے کہا محمد بن عبدالصمد تو حلاج کی زبان سے نکلا خدا کی قسم اب ہم
ہلاک ہوئے۔ پھر اس کو باہر نکالا گیا۔ سائیسوں کی جماعت کے ساتھ ایک خچر پر
سوار کرکے حامد کے غلاموں اور کوتوال کے سپاہیوں کی حراست میں پل تک پہنچایا
گیا۔ حامد کے غلام وہاں سے واپس لوٹ آئے۔ قید خانہ کے اردگرد محمد بن
عبدالصمد اور اس کے آدمیوں نے رات گزاری۔

حافظ ابوبکر الخطیب لکھتے ہیں کہ مجھ سے محمد بن ابی الحسن الساعی نے بیان کیا
اس نے ابوالعباس احمد بن محمد الشوی سے روایت کی ہے اس نے کہا کہ میں نے محمد
بن حسین حافظ کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابراہیم بن محمد الواعظ سے سنا کہ ابوالقاسم
الرازی نے کہا۔ ابوبکر بن ممشاذ نے کہا کہ دینور میں ہمارے پاس ایک آدمی حاضر
ہوا۔ اس کے پاس ایک توبڑا تھا۔ اس کو دن رات اپنے پاس رکھتا تھا۔ لوگوں نے
اس کے توبڑے کی تلاشی لی۔ اس میں حلاج کا ایک خط پایا۔ اس کا عنوان تھا۔ ”
من الرحمٰن الرحیم الی فلاں بن فلاں‘ اس نے اس خط کو بغداد بھیج دیا‘ حسین بن
منصور کو دربار میں لایا گیا اور اس کے سامنے خط پیش کیا گیا۔ اس نے کہا کہ ہاں یہ
میرا خط ہے اور میں نے ہی لکھا تھا۔ انہوں نے کہا تو پہلے نبوت کا دعویٰ کیا‘ پھر
ربوبیت کا۔ اس نے کہا‘ میں نے ربوبیت کا دعویٰ نہیں کیا‘ لیکن یہ بات تو ہمارے
نزدیک این الجمع ہے۔ اس خط کا کاتب تو اللہ ہے اور میں اور میرا ہاتھ محض آلہ کے
ہیں۔ ابن منصور سے کہا گیا۔ کیا اس عقیدہ میں تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔
اس نے کہا۔ ہاں! ابن عطاء‘ جریدی اور ابوبکر شبلی۔ ابو محمد جریری اور شبلی حقیقت
کو چھپاتے ہیں۔ اگر کوئی صاف عقیدہ کا اظہار کرسکتا ہے تو ابن عطاء ہے۔ جریری
کو حاضر کیا گیا‘ اس سے پوچھا گیا۔ اس نے کہا۔ جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے وہ کافر
ہے اور اس کو قتل کیا جائے پھر شبلی سے پوچھا گیا۔ انہوں نے کہا کہ جو شخص اس
عقیدہ کا مدعی ہو اس کو روکنا چاہیے۔ پھر ابن عطاء نے صاف صاف ابن منصور کے
موافق کہا اور یہی ان کے قتل کا سبب ہوا۔

پھر لکھتے ہیں ہمیں اسماعیل بن احمد حیری نے خبر دی کہ ہمیں ابوعبدالرحمٰن
شبلی نے بتایا۔ اس نے کہا کہ میں محمد بن عبداللہ الرازی کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ وزیر
حامد بن عباس نے جب حسین بن منصور کو قتل کرنے کے لیے حاضر کیا۔ تو اس کو
حکم دیا گیا کہ وہ اپنے معتقدات لکھ دے۔ وزیر نے ان معتقدات کو بغداد کے فقہاء
کے سامنے پیش کیا۔ وزیر سے کہا گیا ابوالعباس بن عطاء اس عقیدہ کو صحیح تسلیم کرتا
ہے۔ وزیر نے حکم دیا۔ ان معتقدات کو ابوالعباس بن عطاء کے سامنے پیش کیا جائے
پس ابوالعباس کے سامنے پیش کئے گئے تو انہوں نے کہا یہ اعتقاد صحیح ہے۔ میں بھی
یہی اعتقاد رکھتا ہوں جو شخص یہ اعتقاد نہیں رکھتا اس کا کوئی اعتقاد نہیں۔ وزیر نے
ابوالعباس کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ ان کو جب لایا گیا تو وہ مسند صدارت پر بیٹھ
گئے۔ وزیر کو اس پر بہت غصہ آیا۔ پھر وہ خط نکالا۔ کہا یہ تیرا خط ہے۔ اس نے کہا
ہاں وزیر نے کہا۔ کیا اس قسم کے اعتقادات کو صحیح جانتا ہے۔ اس نے وزیر سے کہا
تم کو اس معاملے سے کیا تعلق‘ تیرا کام تو لوگوں کو ہتھیانا‘ ان پر جور و ستم ڈھانا اور
قتل کرنا ہے‘ تیرا ان بزرگ ہستیوں کے کلام سے کیا واسطہ۔ تم اس کو کیا جانو اور
کیا سمجھو گے۔ وزیر نے نوکروں سے کہا۔ ان کے دونوں جبڑوں پر گھونسہ مارا
جائے۔ چنانچہ غلاموں نے مارنا شروع کر دیا۔ ابوالعباس نے کہا۔ اے اللہ! تونے
اس کے پاس آنے کی وجہ سے مجھ پر سزا کو مسلط کیا ہے۔ وزیر نے کہا۔ اے غلام!
جوتوں سے ان کی مرمت کرو۔ اس نے جوتا اتارا تو وزیر نے کہا۔ ذرا ان کے دماغ
کو صحیح کیجئے پس غلام ان کے سر پر جوتیاں مارتا رہا۔ یہاں تک کہ ان کے دونوں
نتھنوں سے خون بہنا شروع ہوگیا۔ پھر کہا کہ ان کو قید خانہ میں مقید کر دیں۔
ابوالعباس تو اس کے سات دن بعد انتقال کر گئے لیکن حامد بن عباس کو بھی بری طرح
قتل کر دیا گیا اس کے دونوں ہاتھ پاؤں کاٹ دیے گئے اور اس کا گھر نذر آتش کر
دیا گیا۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ ابوالعباس بن عطاء کی بددعا کا نتیجہ تھا۔

پھر تحریر کیا کہ ہمیں محمد بن ابی الفتح نے خبر دی کہ ہمیں محمد بن حسین

نیشاپوری نے بتایا۔ اس نے کہا کہ میں نے ابوبکر بن غالب کو کہتے ہوئے سنا کہ ہمارے بعض دوستوں نے کہا کہ جب انہوں نے حسین بن منصور کو قتل کر ارادہ کیا تو علماء و فقہا کو جمع کر کے ابن منصور کو بادشاہ کے سامنے کیا گیا۔ علماء نے کہا کہ آپ سے ایک مسئلہ دریافت کرنا ہے۔ ابن منصور نے کہا۔ پوچھو۔ علماء نے کہا۔ برہان کسے کہتے ہیں۔ کہا' برہان ان شواہد کو کہتے ہیں جو اہل اخلاص کی صورتوں میں اللہ تعالیٰ پیدا کر دیتا ہے۔ جن کی طرف لوگوں کے دل کھینچے چلے آتے ہیں۔ فقہا نے حاضرین سے کہا۔ یہ کلام اہل زنادقہ کا ہے اور سلطان کو حلاج کے قتل کرنے کا مشورہ دیا میں کہتا ہوں کہ اس قصہ کے راوی نے جو فقہاء کے فتویٰ کا حوالہ اس بات پر کیا ہے یہ راوی مجہول ہے۔ اس کی بات قابل قبول نہیں بلکہ فقہا نے دوسری وجہ سے اس کا قتل ضروری قرار دیا تھا۔

مجھ سے مسعود بن ناصر نے بیان کیا کہ ہمیں محمد بن عبداللہ بن باکو شیرازی نے خبر دی۔ کہا کہ میں نے اب بزدل قزوینی سے سنا اس نے ابوعبداللہ بن خفیف سے ان اشعار کا مطلب پوچھا۔

1- وہ ذات پاک ہے جس کے ناسوت نے اس کے منور اور چمکدار لاہوت کی روشنی کو ظاہر کیا۔

2- پھر وہ اپنی مخلوق میں گل و شارب کی شکل میں ظاہر ہوا۔

3- یہاں تک کہ اس کی مخلوق نے اس کا معائنہ کرلیا جیسے آنکھ کی بینائی کو معائنہ کیا جاتا ہے۔

شیخ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ان اشعار کے کہنے والے پر لعنت کرے۔ عیسیٰ بن بزدل نے کہا کہ یہ اشعار حسین بن منصور کے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ ان کا عقیدہ نہیں ہے بلکہ ان کے خلاف یہ عقیدہ تراشا گیا ہے۔

مقدمے میں حج کے متعلق حلاج کے اعتقاد کے خلاف جرح کی گئی اور حلاج کی ایک کتاب سے یہ عقیدہ بیان ہوا کہ حج کرنے کے بجائے غرباء کو کھانا کھلا کر اور

کپڑے اور رقوم دے کر رخصت کر دیا جائے تو حج ہو جاتا ہے تو ابو عمر القاضی نے حلاج سے کہا کہ یہ عقیدہ کہاں سے لیا۔ حلاج نے جواب دیا کہ حسن بصری کی کتاب "الاخلاص" سے۔ ابو عمر نے کہا اس نے یہ کتاب مکہ میں سنی تھی۔ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جب اس نے حلاج کو "حلال الدم۔ تم جھوٹ کہتے ہو" کہا تو وزیر حامد نے قاضی ابو عمر سے کہا یہ الفاظ لکھ دو۔ قاضی عمر انکار نہ کرسکا۔ اگرچہ حنفی قاضی جس کا عمر معاون تھا نے ایسا فتویٰ جاری کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ قاضی عمر نے حلاج کے خلاف چوراسی دستخط مہیا کرکے فتویٰ سپرد قلم کر دیا۔

روایت ہے کہ ایک روز شبلی حسین بن منصور کو مارنے کے لیے گئے۔ تو انہوں نے کہا کہ "اے ابوبکر ہاتھ روک لے کہ ہم نے بہت بڑا قصد کیا ہے اور ایک کام کے لیے سرگشتہ ہیں اور کام بھی ایسا کہ خود کو مارنے کے لیے آگے لا رہے ہیں۔" چونکہ مخلوق خدا اس کے معاملے میں متحیر تھی۔ اس لیے اس کے منکر بھی بے قیاس تھے اور اسے ماننے والے بھی بے شمار تھے۔ ان لوگوں نے اس سے عجیب عجیب باتیں مشاہدہ کیں اور اس پر زبان درازی کرنے لگے حتیٰ کہ خلیفہ تک اس کی باتیں پہنچائی گئیں اور سب نے اس کے قتل پر اتفاق کیا اس لیے کہ وہ "اناالحق" کہتا تھا۔ اس سے کہا گیا کہ کہو "ہوالحق" اس نے کہا ہاں! ہمہ اوست (سب کچھ وہ ہے) اس نے جواب دیا کہ بہتر ہے اسے مار ڈالیں کہ تاویل کا اب کوئی موقع نہیں اور حکایت کرتے ہیں کہ حضرت شبلی ابن منصور کے پاس قید خانہ میں گئے تو ان کو اس حال میں بیٹھا ہوا پایا کہ مٹی کی لکیریں کھینچ رہے تھے۔ یہ ان کے سامنے بیٹھ گئے اور بہت دیر بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ اس وقت ابن منصور نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی اور عرض کیا کہ الٰہی ہر حق کی ایک حقیقت ہے۔ بعض جانتے ہیں' بعض نہیں جانتے اور ہر مخلوق کے لیے ایک طریقہ ہے۔ کوئی نعمت کے ذریعہ پہنچتا ہے کوئی بلا کے راستہ سے' کوئی سکر سے' کوئی محو سے' کوئی غلبہ کیفیات کے ساتھ' کوئی بدون غلبہ احوال و کیفیات سے اور ہر عہد کی ایک مضبوطی ہے۔ پھر کہا اے

شبلی! جس شخص کو اس کے مولا نے اس کے نفس کے قبضہ سے لے لیا ہو' پھر اس کو اپنی بساط انس تک پہنچا دیا ہو۔ اس کو تم کیسا سمجھتے ہو؟ شبلی نے کہا یہ کیسے ہوتا ہے؟ کہا یہ اس طرح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے نفس کے قبضہ سے لے لیتا ہے۔ پھر اس کو اس کے قلب کے حوالہ کر دیتا ہے پس وہ شخص اپنے نفس سے لے لیا جاتا ہے اور اپنے قلب کے حوالہ کر دیا جاتا ہے پس اس کو نفس سے لے لینا' مہذب فرمانا اور قلب کے حوالہ کرنا مقرب بناتا ہے "اور انس معہ اللہ سے بڑھ کر کون سی جنت ہوگی۔ جنت بھی اسی انس کی وجہ سے جنت بنی ہے خوشحالی ہے ایسے شخص کے لیے جو مولا کا مطیع ہو۔ حقیقت کے آفتاب اس کے قلوب میں چمکتے ہیں۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہی کہ "یہ سب کو معلوم ہے کہ بنو امیہ کی حکومت کا خاتمہ اور بنو عباس کی خلافت کا قیام' صرف اہل عجم کی مذہبی سازش کا نتیجہ تھا' ابو مسلم خراسانی جو اس انقلاب کا ہیرو ہے' وہ کوہستان و خراسان میں داعی بنا' داعی سے نبی اور نبی سے خدا ہوگیا۔ یعنی لوگ اس کو خدا کا اوتار ماننے لگے۔ آخر خلافت عباسیہ کے قیام کے بعد منصور نے ابومسلم کو قتل کر دیا۔ لیکن بایں ہمہ ان مقامات میں اس کی خدائی کا زور باطل نہ ہوا۔ مجوسی پارسی اور اہل عجم اپنی ملکی اور وطنی حکومت کے قیام کی مختلف تدبیریں سوچتے تھے اور وہ سب بیکار ثابت ہوئی تھیں۔ آخری تدبیر وہی کامیاب نظر آئی جو ابو مسلم نے اختیار کی تھی۔ چنانچہ خلافت عباسیہ کے قیام کے ساتھ یہ سازشیں شروع ہوگئیں۔ ایک خرمی اور مقنع خراسانی نے کوہستان' خراسان اور ترکستان کے علاقوں میں سالہا سال تک خدائی کی اور خلیفہ کی فوجیں شکست پر شکست کھاتی رہی اور بڑی مشکل سے یہ فتنہ فرو ہوسکا۔

اہل عجم کا ایک اور گروہ تھا جو ملکی حکومت سے مایوس ہو کر حکمران طبقہ میں اقتدار پیدا کرکے دخیل کار ہونا چاہتا تھا' چنانچہ اس میں ان کو کامیابی ہوئی اور بسفاح سے لے کر ماموں تک تمام کاروبار انہیں کے ہاتھوں انجام پاتا۔ معتصم تخت نشین

ہوا تو اس نے ایرانیوں کی جگہ ترکوں کو دے دی۔ اب مغرب و عجم کی بجائے ترک و عجم میدان میں تھے۔ عام ہر دلعزیزی اور جمہور کی ہمدردی ایران و عراق میں اہل بیت نبوی کے ساتھ تھی چنانچہ دونوں طاقتیں اسی عصا کے سہارے کھڑی ہوئیں۔

معتصم کے بعد عباسیوں کا زوال شروع ہوگیا' درمیان سیادت کا ہر طرف ظہور ہونے لگا' چوتھی صدی کا آغاز تھا کہ ایران و ترکستان کے ایک حصہ میں دیالہ نے اسی شیعیت کے بل بوتے پر ایک مستقل حکومت قائم کرلی اور بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں پیدا ہوگئیں۔ خلافت بغداد کی حیثیت ایک قدیم یادگار کی رہ گئی تھی' ان روساء و سلاطین میں سے جس کا قابو چل جاتا خلافت کے کاروبار پر اپنا قبضہ جما لیتا۔

اسی اثناء میں دو عظیم الشان طاقتیں پیدا ہوگئیں' عراق میں قرامطہ کا گروہ پیدا ہوا اور افریقہ میں ایک مہدی کا ظہور ہوا جو فاطمیت کے مدعی بھی تھے۔ ان کا اعی اور جاسوس درویشوں اور زاہدوں کی صورت میں تمام بلاد اسلامیہ میں پھیل گئے تھے' مہدویوں کا گروہ جن کا دوسرا نام بنو فاطمہ ہے بڑھتے بڑھتے مصر پر قابض ہوگیا اور کئی سو برس تک وہاں بڑے جاہ و جلال سے حکومت کی۔

قرامطہ نے جو حقیقتاً مجوسی تھے' دس بارہ برس تک مسلمانوں پر وہ مظالم ڑے کہ ان کے بیان سے اب تک رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ عین حج کے زمانہ ں عرب پر حملہ کیا اور حاجیوں کے قافلوں کو لوٹ لیا۔ ہزاروں حاجیوں کو تہ تیغ کیا' عبہ سے حجر اسود اکھاڑ کے لے گئے۔ ادھر سے فرصت پا کر دارالخلافہ کا رخ کیا۔ سدم ان کے آگے بڑھنے کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ خلیفہ بغداد سے فوجوں پر جیں بھیج رہا تھا اور وہ شکست کھا کھا کر پیچھے لوٹ جاتی تھیں۔ آخر بڑی مشکل سے ئی سال میں جا کر ان کا زور گھٹا اور صرف ایران کے کوہستانی علاقہ میں باطنیہ کے ب سے سمٹ کر رہ گئے۔ 914ء سے 923ء تک ان فتنوں کے عین عروج اور ہاب کا زمانہ ہے۔ ان فرقوں کے داعی عجیب و غریب عوام فریب دعوؤں کے ساتھ

اٹھتے تھے۔ ظاہری زہد و اتقاء' امر بالمعروف اور شعبدہ گری کی کرامات دکھاتے ہوئے خامشی کے ساتھ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں پھرا کرتے تھے' عوام ان کے گرویدہ ہوتے جاتے اور معتقد بن جاتے تھے' جب ایک جمعیت پیدا ہو جاتی تھی تو موقع پا کر یہ بازی گر جدھر چاہتے تھے ان بے وقوفوں کو جھونک دیتے تھے۔

عین اسی ہنگامہ و مستخیر میں حلاج کا ظہور ہوا۔ دکھانے کے لیے بڑی بڑی ریاضت ہائے شاقہ برداشت کرتا تھا' پہاڑ پر چڑھ کر دن دن بھر دھوپ میں بیٹھا رہتا۔ ہندوستان آ کر یہاں کے نٹوں سے بہت سے شعبدے سیکھے' واپس آ کر عراق کو اس نے اپنا دامن بنایا' پہلے ایک داعی کی حیثیت اختیار کی' لوگوں کو اپنی کرامتیں دکھاتا ہوا سرکاری عہدہ داروں سے نظریں بچاتا ہوا' اس گاؤں سے اس گاؤں اور اس شہر سے اس شہر میں پھرا کرتا تھا' لوگوں کا بڑا مجمع اس کے گرد جمع ہو گیا۔ اب اس نے نئے نئے دعوے شروع کیے اور اس کے مرید ہر بات پر آمنا و صدقنا کہتے جاتے تھے اور آخر خدائی تک نوبت پہنچی۔

سرکاری عہدہ داروں کے سامنے 912ء میں سب سے پہلے اس راز کا افشا ہوا' عراق میں ایک مقام سوس ہے' صاحب البرید یعنی سرکاری محکمہ خبر رسانی کا افسر اعلیٰ' وہاں ایک گلی سے گزر رہا تھا' دیکھا کہ ایک بڑھیا آپ ہی آپ بڑبڑاتی ہوئی جا رہی ہے اور یہ کہتی جاتی ہے کہ "مجھ کو چھوڑ دو' ورنہ میں کہہ دوں گی۔" صاحب البرید نے اس کو ڈرایا دھمکایا تو اس نے کہا کہ میرے گھر کے پاس حلاج نامی ایک شخص آ کر اترا ہے جس کے پاس رات دن لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے' چپکے آتے ہیں اور عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں' اس وقت آدمی بھیجے گئے اور حلاج مع ہمراہیوں کے گرفتار ہوا' پہلے تو وہ انکار کرتا رہا کہ میں حلاج نہیں ہوں۔ میں اس کو جانتا بھی نہیں ہوں لیکن جو پہچانتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ وہی ہے بہرحال وہ قید کر دیا گیا۔ تفتیش کی گئی تو بہت سے خطوط اور کاغذات اس کے پاس سے برآمد ہوئے' ان تمام واقعات کی اطلاع دربار خلافت کو دی گئی اور حلاج کو پابزنجیر بغداد

روانہ کیا گیا' وہاں یہ قید کر دیا گیا۔

اس زمانہ کی اسلامی حکومتوں میں اعلیٰ ترین عہدے دو تھے' وزارت اور حجابت اس وقت بغداد میں حامد بن عباس وزیر اور نصر حاجب تھا' حسب دستور جیسا کہ ہمیشہ باہم بڑے بڑے عہدہ داروں میں ہوا کرتا ہے' حامد اور نصر میں باہم چشمکیں تھیں۔ حامد نے حلاج کو قید کیا تھا۔ حلاج نے اپنا منتر نصر پر پھونکنا شروع کر دیا۔ خلیفہ مقتدر نام کا مقتدر تھا۔ حکومت کی باگ حرم سراؤں کے ہاتھ میں تھی۔ حرم سرا کی بڑی ماما کو قہرمانہ کہتے ہیں' جس کے ہاتھ میں تمام حرم سرا کا جزو کل ہوتا ہے' یہ قہرمانہ سلطنت کے انتظامات میں اس قدر دخیل کار ہو گئی تھی کہ اس کے مشورہ کے بغیر کوئی کام انجام نہیں پا سکتا تھا خلیفہ کی ماں باقاعدہ دربار لگا کر بیٹھتی تھی اور احکام نافذ کرتی تھی۔

عورتوں کا ہر زمانہ میں دعاء تعویذ' گنڈا اور دیگر عجائبات و نایابات پر جس قدر جلد یقین آ جاتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ حلاج ان فنون میں طاق تھا۔ اس نے انہیں ہتھیاروں سے ان پر وار شروع کر دیئے' ہر وار کارگر ثابت ہوئے حرم کی عورتیں' بہت سے وزراء' آس پاس کے امراء' دارالخلافہ کے بہت سے اعلیٰ عہدہ دار اور شہر کے عوام کو اس نے اپنا ہم آہنگ بنا لیا۔ نصر صاحب بھی اس سے جا کر مل گیا' اب انقلاب حکومت کا پورا مسالہ تیار ہو گیا۔ حامد نے یہ دیکھا تو خلیفہ سے اس کے قتل کا اذن طلب کیا' اور اس کی کتابیں پیش کیں جن میں بعض باتیں خلاف شریعت تھیں۔ قاضی نے اس کے قتل کا محضر تیار کیا۔ چند علماء نے اس پر دستخط کر دیئے۔ خلیفہ نے بھی آخری فرمان صادر کر دیا۔ حلاج قید خانہ سے نکال کر پولیس کے حوالے کیا گیا۔ اس نے اپنے اہتمام میں دریائے فرات کے کنارے اس کو قتل کر دیا۔

حلاج شہید انا الحق نہ تھا قتیل راہ سیاست تھا۔ اس کی حیثیت مذہبی گناہ گار کی اتنی نہیں جتنی ایک پولٹیکل مجرم کی تھی۔ اس کی بے گناہی کا خون (اگر وہ بے

گناہ ہے) علماء کے قلم پر نہیں بلکہ سلاطین کی تلوار پر ہے۔ حلاج نے جو مذہبی یا سیاسی گروہ پیدا کیا تھا وہ اس کے قتل سے فنا نہ ہوا اور مدتوں ایران کے کوہستانی علاقوں میں وہ زندہ رہا۔ ابو ریحان بیرونی جس کی وفات کا زمانہ 1053ء ہے۔ بیان کرتا ہے کہ اس وقت تک اس کے مذہب کے کچھ پیرو موجود ہیں۔ حلاج کے قتل کے بعد اس کے مریدوں نے وہی باتیں اس کی نسبت مشہور کیں جو ہمیشہ ناکام مدعی کے پیرو ظاہر کرتے رہے یعنی وہ مرا نہیں ہے زندہ ہے اور پھر وہ لوٹ کر آئے گا۔"

ابن ندیم لکھتے ہیں کہ حسین بن منصور نے حامد وزیر سے کہا کہ میں تم سے مباہلہ کرنا چاہتا ہوں حامد نے جواب دیا کہ "اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوگئی ہے کہ تم پر جو الزامات عائد کیے جاتے ہیں تم ان کے مرتکب ہو۔"

قاضی ابو عمر گواہوں کا افسر تحقیقات ہونے کے ناطے اسی دستخط کنندگان کو پیش کرنے میں کامیاب ہوگیا اور قاضی کی کرسی پر بیٹھ کر حامد کے زور دینے پر "خون بہانا جائز ہے۔" فیصلہ سنایا۔ اس فیصلے کے بعد دو دن تک نصر اور خلیفہ کی والدہ حلاج کے حق میں خلیفہ سے سفارش کرتے رہے۔ آخر خلیفہ نے بخار کی حالت میں پھانسی کی سزا منسوخ کر دی۔ لیکن وزیر حامد کی سازشوں نے خلیفہ المقتدر کی قوت فیصلہ پر فتح حاصل کرلی اور خلیفہ نے حلاج کی سولی کے وارنٹ پر دستخط کر دیئے۔ حسین بن منصور کو ایک ہزار کوڑوں کی سزا دی گئی پھر ان کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کے بعد ان کا سر تن سے جدا کیا گیا اور لاش کو جلا کر اس کی راکھ دریا دجلہ میں بہا دی گئی سر کو دو دن تک بغداد کے پل پر نصب کیا گیا پھر خراسان بھیج دیا گیا اور اطراف و اکناف میں گھمایا گیا۔ اسی موقعہ کی نسبت سے مولانا روم فرماتے ہیں کہ "جب نااہل لوگوں کے ہاتھوں میں اقتدار آجاتا ہے تو ولیوں اور بزرگوں کو قتل کرنا تو درکنار۔ پیغمبروں کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔"

پروفیسر ماسینون نے اپنی تصنیف "تصوف میں شخصیت کا تصور" میں لکھتے ہیں

کہ "جب حلاج کو عدالت میں پیش کیا گیا تو ارکان عدالت نے کہا کہ اس پر فرد جرم ائد کرنی چاہیے کیونکہ اس نے لکھا ہے کہ حج کعبہ فرض نہیں ہے بلکہ لائق تنسیخ ہے۔ اس کے علاوہ وہ قرامطہ سے خفیہ طریق اور مراسلت کرتا رہا ہے۔ نیز اس کا یہ ہنا کہ میں خدا سے متحد ہوگیا ہوں اگرچہ اس کے مجرم ہونے کے لیے کافی نہ تھا مگر ں عقیدہ اتحاد کو جس انداز سے اس نے پیش کیا تھا وہ بلاشبہ مسلمانوں کی نظر میں ابل نفرت و ملامت تھا۔" پھر لکھتے ہیں کہ "حلاج نے ازدواجی زندگی کے بعد بصرہ کے ایک محلہ تمیم میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ یہ محلہ بنی مجاشع کا گڑھ تھا جو سیاسی تبار سے زیدیہ زنج کی شورش سے تعلق رکھتے تھے۔ حلاج کے ان سے گہرے وابط تھے یہ لوگ حکومت میں انقلاب لانا چاہتے تھے۔ حلاج کی پہلی گرفتاری ان اسباب کے ماتحت عمل میں آئی۔ اور پھر حلاج جوانی کے زمانہ سے تادم مرگ 6 سال کی عمر تک ہر قسم کی تکالیف برداشت کرتا رہا۔"

زمزمہ موت

24 ذی قعد 309ھ کو بغدادی باب خراسان کے سامنے تپتی ہوئی دھوپ اور خلقت کے اژدھام کے سامنے سلطان العشق حسین بن منصور کو لایا گیا۔ آپ کو ٹکٹکی پر باندھا گیا۔ جلاد نے کوڑے برسانے شروع کئے' کوڑے پر پراسرار آواز گونجتی۔ تین سو کوڑے لگنے کے باوجود حسین منصور نے اف تک نہ کی اور عربی اشعار پڑھتے رہے۔

میرا ندیم ذرا سا بھی ظالم نہیں۔
اس نے مجھے وہ شراب پینے کو دی جو ایک میزبان مہمان کو
دے سکتا ہے۔
اور جب جام پہ جام لٹائے جا چکے
تو اس نے شمشیر اور کوڑا تھام لیا
اور بولا اس کے لیے یہی سزا ہے
یہ شخص اسی سزا کے قابل ہے اژدھے کے سامنے سخت گرمی
میں ۔
بھلا اسے شراب پینے کی جسارت ہوئی کیسے؟

مشاق جلادوں نے انتہائی بے دردی اور کمال آہستگی کے ساتھ قطع و برید کی۔ لوگوں نے پتھروں' لاٹھیوں اور تھموں سے دیر تک مارا۔ پہلے دونوں ہاتھ کاٹے گئے۔ پھر قدم کاٹے گئے۔ پھر دونوں کان' ناک' زبان اور دونوں آنکھیں اپنے تن سے جدا کر دیئے گئے۔ رات بھر انہیں جان کنی کی حیرت انگیز اور ناقابل تخیل حالت میں زندہ رکھا گیا اور اگلے دن سر قلم کیا گیا۔ پھر اس کی لاش کو ٹاٹ میں لپیٹ کر جلا دیا گیا اور اس کی راکھ ایک مینار سے ہوا میں اڑا دی گئی۔

تذکرۃ الاولیاء اور دوسری بعض کتب میں ہے کہ حلاج کے بریدہ جسم کے ہر

عضو سے اناالحق کی آواز آتی تھی اور ان کے خون کا ہر قطرہ اللہ اور اناالحق کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔

ابراہیم ابن فاتک بیان کرتے ہیں کہ جب حسین بن منصور کو مصلوب کرنے کے لیے لایا گیا اور انہوں نے صلیب اور میخوں کو دیکھا تو اس شدت سے ہنسے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ پھر انہوں نے مجمع کی طرف نگاہ ڈالی تو شبلی کو دیکھ کر کہا اے ابوبکر تمہارے پاس تمہارا سجادہ ہے۔ انہوں نے کہا بلی یا شیخ! یہ سن کر حلاج نے کہا "بچھا دو" پھر حلاج نے اس پر کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھی۔ پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد یہ آیت پڑھی۔ "ہم ضرور کسی قدر ڈر اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے تمہارا امتحان کریں گے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دو جنہیں جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں۔ یہ اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔" اس کے بعد دوسری رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد یہ آیت پڑھی۔ "ہر ایک شخص موت کو چکھنے والا ہے اور تم کو قیامت کے دن تمہارے پورے اجر دیئے جائیں گے۔ پس جو آگ سے دور رکھا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ ضرور اپنی مراد کو پہنچ گیا اور دنیا کی زندگی تو نری دھوکے کی پونجی ہے۔" (اے آر نکلسن لکھتا ہے کہ یہ روایتی نماز نہ تھی بلکہ ایک صوفی کے آزاد نماز تھی۔" جب حلاج نماز سے فارغ ہوا تو اس نے دعا مانگی۔ "اے اللہ! میں تیری منت کرتا ہوں کہ تو مجھے اس فضل و کرم کا شکر ادا کرنے کی توفیق عنایت فرمائے جو تو نے میرے حال زار پر کیا ہے اور وہ کرم یہ ہے کہ تو نے مجھے اپنے تابناک چہرے کی وہ تجلی دکھائی ہے جسے تو نے دوسروں پر ظاہر نہیں کیا۔ اے اللہ! یہ تیرے بندے ہیں جو تجھے تیرے دین کی حمایت میں قتل کرنے آئے ہیں اور تجھے قتل کرکے تیری خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں' تو ان کو معاف کر دے اور ان پر رحم کر۔ کیونکہ اگر تو ان پر وہ (مشقت) ظاہر کر دیتا جو تو نے مجھ پر ظاہر کی ہے تو یہ لوگ وہ کام نہ کرتے جو کریں گے اور اگر تو مجھ سے وہ پوشیدہ

رکھتا جو بات ان سے پوشیدہ رکھی ہے تو میں اس بلا (آزمائش) سے مبتلا نہ ہوتا۔ پس تیرے لیے حمد ہے جو تو کرتا ہے اور تیرے لیے حمد ہے جو تو ارادہ کرتا ہے۔" دعا مانگنے کے بعد وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہے اور دل ہی دل میں اپنے خدا سے مناجات کرتے رہے یہاں تک کہ جلاد (ابوالحارث) کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا اور اس نے حلاج کے منہ پر اس زور کا تھپڑ مارا کہ اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے نالہ کیا' اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ابوالحسین الواسطی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے صوفیہ کا بھی یہی حال ہوگیا۔ لوگ آپے سے باہر ہوگئے' قریب تھا کہ فتنہ برپا ہو جاتا محافظوں نے حلاج کو فوراً مصلوب کر دیا۔

ابوالحسن حلوانی نے کہا میں نے دیکھا کہ حلاج بیڑیاں پہنے ہوئے اکڑتے ہوئے سولی کی طرف آ رہے تھے اور یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

"میرا دوست مطلقاً ظلم کی طرف منسوب نہیں ہے۔ مجھے بلایا اور مجھے خوش آمدید کہا۔ جیسے میزبان مہمان کو خوش آمدید کہتا ہے۔ جب جام شراب گردش میں آیا اور اس نے تلوار اور نطق منگایا۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے اس شخص کا جو موسم بہار میں اژدھے کے ساتھ شراب پیتا ہے۔"

ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب حلاج کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور میں نے ان سے پوچھا۔ "تصوف کیا ہے؟" انہوں نے جواب دیا۔ "جو کچھ تو دیکھ رہا ہے یہ اس کا زیریں مرتبہ ہے۔" میں نے پوچھا "اس کا اعلیٰ مرتبہ کیا ہے؟" انہوں نے جواب دیا تو اسے سمجھ نہیں سکتا مگر کل یہاں آ کر دیکھ لینا۔ جو میں نے دیکھا ہے وہ تیری نگاہ سے غائب ہے۔" جب عشاء کا وقت ہوا تو خلیفہ کا حکم آیا کہ ان کی گردن مار دی جائے محافظوں نے کہا اب تو رات ہوگئی ہے۔ کل صبح ماریں گے۔ پس جب صبح ہوئی تو انہیں صلیب سے اتارا گیا اور جائے قتل کی طرف لے جایا گیا۔ اس وقت انہوں نے با آواز بلند کہا۔ "پانے والے کے لیے یہ بالکل کافی

ہے کہ الواحد اس کے لیے تنہا رہ جائے۔" اور اس کے بعد یہ آیت پڑھی۔ "جو لوگ اس کا یقین نہیں رکھتے ہیں اس کی جلدی کرتے ہیں اور جو یقین رکھتے ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ حق ہے۔" یہ آخری بات تھی جو ان کے منہ سے سنی گئی۔ احمد بن فاتک نے کہا کہ جب حلاج کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے تو انہوں نے کہا۔ "اے خدا میں دالر الغائب میں رہا تاکہ عجائبات دیکھوں۔ اے اللہ تو اس سے بھی محبت کرتا ہے جو تجھے ایذا دیتا ہے تو اس سے کیسے محبت نہ کرے گا جسے تیری وجہ سے ایذا دی گئی۔"

ابوبکر احمد بن علی الخطیب البغدادی لکھتے ہیں کہ ہمیں اسماعیل الحیری نے خبر دی۔ ہمیں ابوعبدالرحمٰن السلمی نے بتایا۔ اس نے کہا کہ میں نے محمد بن احمد بن حسین کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابواسحق ابراہیم بن محمد قلانسی الرازی کو کہتے ہوئے سنا کہ جب حسین بن منصور کو صلیب دی گئی تو میں ان کے پاس کھڑا تھا۔ انہوں نے کہا۔ "اے میرے اللہ! میں نے مرغوبات کے گھر میں صبح کی اور عجائبات کو دیکھ رہا ہوں۔ اے میرے اللہ! تو تو اس شخص سے بھی دوستی کا برتاؤ کرتا ہے جو تجھ کو ایذا دیتا ہے تو تو اس شخص سے دوستی اور محبت کا برتاؤ نہ کرے گا جس کو تیری راہ میں ایذا دی جاتی ہے۔

○ السلمی نے کہا کہ میں نے عبدالواحد بن علی کو کہتے ہوئے سنا کہ میں فارس البغدادی سے سنا کہ جب حلاج کو ٹخنوں سے گھٹنوں تک تیرہ بیڑیوں میں گاڑھ دیا گیا تو وہ اس حالت میں بھی ہر روز ایک ہزار رکعت نماز ادا کیا کرتے تھے۔ اس نے کہا' کہ میں نے فارس سے سنا کہ قتل کیے جانے کے دن ان کا ایک عضو کاٹا گیا لیکن ان کے چہرے کی رنگت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

السلمی نے کہا کہ میں نے ابوعبداللہ الرازی کو کہتے ہوئے سنا کہ ابوبکر عطوفی کہتے تھے کہ میں نے قتل کے دن حلاج کے بہت قریب تھا اس کو

کوڑے مارے گئے، پھر اس کے ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹے گئے، لیکن زبان پر ایک حرف تک نہ لایا۔ پھر لکھتے ہیں کہ ہمیں ابوالفتح نے خبر دی کہ ہمیں محمد بن حسین نے بتایا کہ میں نے حسین بن احمد الرازی کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابوالعباس بن عبدالعزیز کو کہتے ہوئے سنا کہ جس وقت حلاج کو کوڑے مارے گئے تو میں اس وقت سب لوگوں سے حلاج کے قریب تھا۔ وہ ہر تازیانے کی ضرب پر احد، احد (اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے) کہتے تھے، ہم سے عبید اللہ بن احمد بن عثمان الصیرفی نے بیان کیا۔ کہا کہ ہم سے ابوعمر بن حیویہ نے بیان کیا کہ جب حسین حلاج کو قتل کرنے کے لیے نکالا گیا تو میں بھی لوگوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ لوگوں کے ہجوم میں گھستا ہوا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میں نے ان کے قریب ہو کر دیکھا کہ اپنے اصحاب سے کہہ رہے تھے کہ "میری اس حالت سے گھبرانا نہیں چاہیے کیونکہ میں چالیس دن کے بعد تمہارے پاس آجاؤں گا۔" پھر انہیں قتل کر دیا گیا۔

ہمیں محمد بن احمد بن عبداللہ الاروستان نے مکہ میں خبر دی ہمیں ابوعبدالرحمٰن محمد بن حسین السلمی نے نیشاپور میں بتایا کہ میں نے ابوالعباس رازی کو کہتے ہوئے سنا کہ میرا لڑکا حسین بن منصور کا خادم تھا۔ میں نے اس کو کہتے ہوئے سنا جس رات حسین کو قتل کیا جانا تھا میں نے ان سے کہا۔ اے میرے آقا! مجھے وصیت کیجئے۔ کہا اپنے نفس کی نگہداشت رکھ۔ اگر تو اسے حق (یاد اور اطاعت الٰہی) میں نہ لگاؤ گے تو وہ تجھے حق تعالیٰ سے ہٹا دے گا اور اپنے مشغل میں لگا دے گا۔ جب صبح ہوئی اور حسین کو قتل کرنے کے لیے لایا گیا تو انہوں نے کہا۔ "پانے والے کے لیے یہی کافی ہے کہ تنہا خدا اس کا ہے۔" پھرہ بیڑیوں کو چھنکاتے ہوئے بڑے ناز و ادا سے یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ

میرا ندیم ظلم و ستم کی طرف منسوب نہیں کیا گیا۔

اس نے مجھے اس طرح جام شراب پلایا جس طرح وہ پیتا تھا جیسے ایک مہمان دوسرے مہمان کے ساتھ برتاؤ کرتا تھا۔

پس جب جام کا دور چلا تو اس نے چمڑا اور تلوار منگوالی۔

ایسی ہی حالت ہوتی ہے اس شخص کی جو اژدھام میں سے گرمی کے موسم میں شراب پیئے۔

پھر کہا جو ایمان نہیں لائے وہ جلدی کرتے ہیں اور جو لوگ ایمان لے آئے وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ حق اور صداقت ہے۔ پھر انہوں کوئی بات نہیں کی۔ یہاں تک کہ انہیں قتل کر دیا گیا۔

ہمیں ابن الفتح نے خبر دی کہ ہمیں محمد بن حسین نے خبر دی اس نے کہا۔ میں نے عبداللہ بن علی کو کہتے ہوئے سنا۔ میں نے عیسیٰ کو وہ آخری بات کہتے ہوئے سنا جو حسین بن منصور نے صلیب پر چڑھتے ہوئے کہی تھی۔ "پانے والے کے لیے یہی کافی ہے کہ تنہا خدا اس کا ہے۔" اس جملہ کو مشائخ میں سے جس نے بھی سنا اس پر رقت طاری ہوگئی اور ان کی اس بات کو سبھی نے پسند کیا۔

ہمیں اسماعیل الخیری نے خبر دی۔ ہمیں ابوعبدالرحمٰن السلمی نے بتایا۔ اس نے کہا میں نے ابوبکر بجلی کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابوالفاتک بغدادی سے سنا۔ عبدالصمد سے کہا کہ جب حسین بن منصور کو ہزار کوڑے لگ چکے تو اس کا ایک ہاتھ کاٹا گیا پھر دوسرا ہاتھ کاٹا گیا۔ پھر ایک پاؤں پھر دوسرا پاؤں کاٹا گیا اور اس کا سر کاٹا گیا۔ پھر اس کا جسم نذر آتش کر دیا گیا۔ میں اس وقت حاضر تھا اور جیل خانہ سے باہر اپنی سواری کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا جسم انگاروں اور آگ پر لوٹ پوٹ ہوتا تھا۔ جب جسم جل کر راکھ ہو گیا تو اس کو دریائے دجلہ میں بہا دیا گیا اور

اس کا سر دو دن کے لیے بغداد میں پل پر نصب کر دیا گیا پھر خراسان لے
جایا گیا اور اس کو نواح میں گھمایا گیا۔ اس کے مرید اپنے دلوں کو طفل
تسلی دیتے رہے کہ وہ چالیس دنوں کے بعد واپس لوٹ آئے گا۔ اتفاق
ایسا ہوا کہ اس سال دجلہ کا پانی معمول سے زیادہ بڑھ گیا۔ تو اس کے
مریدوں نے کہا' یہ ابن منصور کا معجزہ ہے کیونکہ اس کی راکھ پانی میں ڈالی
گئی تھی۔ بعض پیروکاروں نے یہ دعویٰ کیا کہ انہوں نے قتل کے دن ب
سب کچھ ہو جانے کے بعد نہروان کے راستہ میں اس کو گدھے پر سوا
دیکھا۔ لوگ ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تو فرمایا۔ شاید تم ان بیلو
(بے وقوفوں) کی طرح' یہ سمجھ رہے ہو کہ مضروب و مقتول میں ہی تھا۔
بعض نے یہ گمان کیا ہے وہ جانور اس کی شکل میں بدل گیا تھا۔ حلاج کے
قتل کے بعد افسوس کرتے ہوئے نصر کہا کرتا تھا کہ وہ مظلوم تھا۔ خدا کے
نیک بندوں میں سے تھا۔ کتب فروشوں کی ایک جماعت کو بلایا اور ا
سے قسم لی کہ وہ حلاج کی کتب کی کبھی خرید و فروخت نہیں کریں گے۔

فرید الدین عطاء رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب تذکرۃ الاولیاء میں حسین بن منصو
حلاج کی موت کے بارہ میں تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قتل گاہ پر کو
ایک لاکھ آدمی تھے۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے اور کہتے جاتے تھے۔ "حق ح
حق انا الحق" کہتے ہیں کہ اسی دوران کسی درویش نے ان سے پوچھا ک
عشق کسے کہتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ تم آج دیکھو گے' کل دیکھ
گے اور پرسوں دیکھو گے یعنی ایک روز انہیں مار ڈالا گیا۔ دوسرے رو
ان کی لاش کو جلا دیا گیا اور تیسرے روز ان کی راکھ ہوا میں اڑا دی گئی
گویا عشق اسے کہتے ہیں۔ مرنے سے قبل ان کے خادم نے ان
وصیت پوچھی۔ انہوں نے کہا نفس کو کسی ایسے کام من مصروف رکھ
کرنے کے لائق ہو' ورنہ وہ تجھے ایسے کام میں مشغول رکھے گا جو نا کردنی

ہوگا۔ کیونکہ اس حال میں اپنے ساتھ ہونا اولیاء کا کام ہے۔ ان کے بیٹے
نے کہا مجھے کوئی وصیت کریں۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ اہل جہاں اعمال
میں کوشاں ہوتے ہیں' تو کسی ایسے کام کی کوشش کر جس کا ایک زرہ بھی
جن و انس کے مدار اعمال سے بہتر ہو اور یہ چیز صرف علم حقیقت ہی
ہے۔

جس وقت وہ راہ چلتے تو تیرہ بوجھل بیڑیوں کے ساتھ بھی وہ ٹہلتے
ہوئے' دست افشاں اور جھومتے ہوئے چلتے' کسی نے پوچھا یہ ٹہلنا اور
خرام کیسا؟ بولے اس لیے کہ میں قربان گاہ کی طرف جا رہا ہوں۔ پھر وہ
نعرہ مارتے اور یہ شعر پڑھتے:

ندیمی غیر منسوب الی شئی من الحیف
سقانی مثل مایشرب کفعل النصیف بالنصیف
فلما دارت الکاس دعا بالنطع والسیف
کذا من یشرب الراح مع التینن باصیف

جب انہیں دار کے نیچے لے گئے تو انہوں نے محرابی دروازے کو
بوسہ دیا اور پاؤں سیڑھی پر رکھا۔ ان سے پوچھا گیا حال کیسا ہے جواب
دیا' مردوں کی معراج دار پر ہے۔ پھر انہوں نے زیر جامہ پہنا اور چادر
کندھوں پر رکھی اور قبلہ رو ہو کر ہاتھ اٹھائے اور مناجات کی۔ پھر بولے
کہ جو کچھ وہ جانتا ہے کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ اس کے بعد وہ دار پر چڑھ
گئے۔ مریدوں کی ایک جماعت نے پوچھا کہ ہمارے بارے میں کہ ہم آپ
کے مرید ہیں اور ان لوگوں کے متعلق جو آپ کے منکر ہیں اور آپ کو
پتھر ماریں گے۔ آپ کیا فرماتے ہیں۔ حسین منصور بولے۔ ان لوگوں کے
لیے دو ثواب ہیں اور تمہارے لیے ایک۔ اس لیے کہ تمہیں میرے
بارے میں صرف حسن ظن ہے جبکہ ان لوگوں کی جنبش و حرکت' قوت

توحید اور استواری شریعت سے ہے اور شرع کے لحاظ سے توحید' اصل ہے اور حسن ظن فرع۔

اس موقع پر اپنے خادم سے کہنے لگے کہ جو کوئی اس طرح اوپر دیکھتا ہے آخر اسی طرح نیچے دیکھتا ہے۔ اب شبلی ان کے سامنے کھڑے ہوگئے اور آواز دی۔ **ماالتصوف یا حلاج؟** (اے حلاج تصوف کیا؟) انہوں نے جواب دیا اس کی کمترین صورت یہ ہے کہ جو تو دیکھ رہا ہے۔ پھر ان سے پوچھا گیا اس کی بلند ترین صورت کون سی ہے؟ حلاج بولے۔ تیری اس تک رسائی نہیں ہے۔ اس کے بعد لوگوں نے انہیں پتھر مارنے شروع کر دیئے۔ شبلی نے بھی موافقت کرتے ہوئے انہیں مٹی کا ڈھیلا مارا۔ جس پر منصور نے آہ بھری۔ لوگوں نے کہا کہ اتنے پتھروں پر تو تونے کوئی آہ نہ بھری۔ اس ڈھیلے پر ایسی آہ کا کیا مطلب؟ حسین نے کہا وہ اس لیے کہ یہ لوگ نہیں جانتے لہٰذا وہ معذور ہیں لیکن اس سے مجھے تکلیف ہوئی کہ یہ جانتا ہے کہ نہیں مارنا چاہیے۔ ازاں بعد ان کا ہاتھ جدا کر دیا گیا جس پر وہ ہنس دیئے۔ ان سے اس ہنسی کا سبب پوچھا گیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ بندھے ہوئے آدمی کا ہاتھ جدا کرنا آسان ہے مرد وہ ہے جو دست صفات کو' کہ سر عرش سے کلاہ ہمت اتار لیتا ہے' کاٹ ڈالے۔ اب اس کے پاؤں کاٹ دیئے گئے وہ مسکرا دیئے اور بولے ان پاؤں سے میں زمین کا سفر کیا کرتا تھا۔ میرے پاس ایک اور قدم ہے۔ جو چاہے تو اسی وقت دونوں جہانوں کا سفر کرے۔ سو اگر تم کاٹ سکو تو میرا یہ قدم کاٹ ڈالو۔ پھر انہوں نے اپنے دونوں کٹے ہوئے خون آلود بازو اپنے چہرے پر ملے جس سے ان کی دونوں کلائیاں اور چہرہ خون سے تربتر گئے۔ ان سے پوچھا گیا کہ ایسا کیوں کیا ہے؟ وہ بولے میرے جسم سے بہت سا خون بہہ گیا ہے اور مجھے پتا ہے کہ میرا چہرہ پیلا پڑ گیا ہوگا سو اس

خیال سے کہ کہیں تم یہ نہ سمجھو کہ میرے چہرے کی یہ زردی خوف کے سبب ہے میں نے چہرے پر خون مل لیا تاکہ تم لوگوں کی نظروں میں سرخ رو رہوں۔ کیونکہ مردوں کا گلگونہ ان کا خون ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اگر آپ نے چہرہ خون سے سرخ کرلیا تو ٹھیک لیکن کلائی خون سے آلودہ کرنے کا کیا مطلب؟ حلاج نے جواب دیا۔ وضو کے لیے۔ پوچھا گیا کیسا وضو؟ بولے' **رکعتان فی العشق لا یصح وضو هما الا بالدم** (عشق میں دو رکعتیں ہیں جن کے لیے درست وضو صرف خون ہی سے ہوتا ہے)

اس کے بعد حلاج کی آنکھیں نکال دی گئیں جس پر لوگوں میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ بعض لوگ رونے لگے۔ بعض نے پتھر مارنے شروع کر دیئے۔ اب متعلقہ اہلکاروں نے اس کی زبان کاٹنا چاہی تو حلاج بولا۔ اتنی مہلت دو کہ میں ایک بات کہہ لوں۔ پھر منہ آسمان کی طرف اٹھا کر بولے۔ یاالٰہی! اس تکلیف پر جو یہ تیرے لیے مجھ پر روا رکھ رہے ہیں' انہیں محروم نہ رکھیو اور اس "دوست" سے بے نصیب نہ کیجیو۔ الحمد اللہ کہ انہوں نے تیری راہ میں میرے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے اور اگر سرتن سے جدا کر دیں تو تیرے جلال کے مشاہدے کے لیے تختہ دار پر چڑھا دیں گے۔ پس ازاں حلاج کے کان ناک کاٹ دیئے گئے۔ اسی اثنا میں ایک بڑھیا کوزہ بدست اس طرف کو آنکلی جب اس نے حسین حلاج کو دیکھا تو بولی' اسے مارو اور خوب مارو کہ اس کم بخت خود بیں کو خدا کی باتوں سے کیا کام۔

حسین نے آخری مرتبہ یہ کلمات کہے۔ **یستعل بها الذین لا یومنون بها والذین امنو مشفقون منها و یعلمون انها الحق** اس کے اس آخری کلام کے بعد اس کی زبان کاٹ دی گئی۔ پھر نماز شام کے

وقت اس کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ اس عمل کے دوران اس نے تبسم کیا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور لوگوں نے فریاد غوغا سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس طرح حسین قضا کی گیند کو میدان رضا کے آخر تک لے گئے۔ اس کے ایک ایک عضو تن سے اناالحق کی آواز آتی رہی۔ دوسرے روز یہ بات چل نکلی کہ یہ فتنہ تو مرنے کے بعد پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی بڑھ جائے گا۔ چنانچہ ان کے اعضاء کو جلا دیا گیا۔ اب ان کی خاکستر سے اسی طرح اناالحق کی آواز آنے لگی جس طرح وقت قتل ان کے ہر گرنے والے قطرہ خون سے "اللہ" کا لفظ بن جاتا تھا۔ عاجز اور تنگ آ کر راکھ کو دریائے دجلہ میں بہایا گیا تو پانی پر سے "اناالحق" کی آواز آنا شروع ہو گئی۔ حسین نے کسی وقت یہ کہہ دیا تھا کہ جب ہماری خاکستر دجلہ میں بہائی جائے گی تو بغداد کے غرق ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا' ایسی صورت میں ہمارا خرقہ پانی کے پاس لے جایا جائے' ورنہ آب دجلہ بغداد کی تباہی کا سبب بن جائے گا۔ اب جو اس کے خادم نے خاکستر دریا میں بہائے جانے پر یہ صورت حال دیکھی تو ان کا خرقہ لے کر دجلہ کے کنارے پہنچا جس سے پانی معمول کے مطابق بہنے لگا اور خاکستر خاموش ہو گئی۔ پھر اس خاکستر کو اکٹھا کر کے دفنا دیا گیا۔

قصہ کوتاہ اہل طریقت میں سے کسی کو بھی یہ فیروزی و کامرانی میسر نہیں آئی۔ کسی بزرگ نے کہا کہ اے طریق معنی کے راہرو ذرا دیکھو کہ حسین منصور جیسے راہرو کے ساتھ کیا کیا گیا' تو محض دعوے داروں کے ساتھ کیا کیا کچھ نہ کیا جائے گا' عباسی طوسی کا کہنا ہے کہ قیامت کے روز منصور حلاج کو زنجیر پہنا کر میدان حشر میں لایا جائے گا' اس لیے کہ اگر اسے کھلے بندوں لایا گیا تو وہ قیامت برپا کر دے گا۔ ایک بزرگ نے یہ بات کہی کہ میں اس رات (جب اسے قتل کیا گیا) اس سولی کے نیچے

صبح تک موجود رہا اور نماز پڑھتا رہا۔ جب دن چڑھا تو غائب سے آواز آئی **اطلعناه علی سر من اسرار نافافشی سرنا فهذا اجزاء من یفشی سرالملوک** یعنی ہم نے اسے اپنے اسرار میں سے ایک راز سے آگاہ کیا۔ سو جو کوئی راز ملوک افشا کرتا ہے اس کی یہی سزا ہے۔

شبلی سے روایت ہے کہ میں (شبلی) اس رات ان کی قبر پر گیا اور صبح تک نماز پڑھتا رہا۔ اس کے بعد میں نے دعا کی کہ بارالہا! یہ (حلاج) تیرا بندہ مومن و عارف اور موحد تھا تو نے اسے اس بلا و آزمائش میں کیوں ڈالا' شبلی کہتے ہیں کہ اس کے بعد مجھ پر نیند طاری ہو گئی۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ قیامت کا دن ہے اور خدا کی طرف سے یہ فرمان ہوا کہ میں نے یہ اس لیے کیا کہ اس نے ہمارا راز غیر سے کہہ دیا تھا۔

شبلی ہی سے روایت ہے کہ "میں نے منصور کو خواب میں دیکھا۔ میں نے ان سے کہا کہ خدا تعالیٰ نے اس قوم سے کیا کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس نے دونوں جماعتوں پر رحم و کرم فرمایا' وہ اس طرح کہ جس گروہ نے مجھ سے شفقت کا اظہار کیا اس نے گویا مجھے سمجھ لیا تھا اور جس گروہ نے مجھ سے عداوت برتی وہ دراصل مجھے نہ سمجھ سکا اور اس نے محض حق کی خاطر یہ عداوت اختیار کی۔ لہٰذا دونوں گروہ اس کی رحمت کے مستحق ٹھہرے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ معذور تھے۔

کسی اور شخص نے انہیں خواب میں دیکھا کہ قیامت میں جام بدست کھڑے ہیں لیکن دھڑ سر کے بغیر ہے۔ ان سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ حلاج بولے۔ "وہ (خدا) سر بریدہ لوگوں کو جام عطا کرتا ہے۔"

روایت ہے کہ جب انہیں سولی پر چڑھایا گیا تو ابلیس آیا اور ان سے کہنے لگا کہ ایک "انا" تو نے کہی اور ایک "انا" میں نے کہی تھی۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ تجھ پر تو رحمت کی بارش ہوئی اور میں راندہ درگاہ ٹھہرا؟ حلاج نے جواب دیا۔ کہ تیری انا تیری ذات میں رہی جب کہ میں نے اسے خود سے دور کر دیا۔ اسی بنا پر مجھے

سزاوار رحمت گردانا گیا اور تو اس سے محروم رہا۔ جیسا کہ تونے دیکھا اور سنا۔ اور یہ اس لیے کہ تو جان لے کہ اظہار انا پسندیدہ نہیں ہے جب کہ اس "میں" کو خود سے دور کرنا اور دور رکھنا قابل صد ستائش ہے۔

حکایت کی جاتی ہے کہ ان کا ایک منکر (مخالف) پھانسی کے وقت ان کے سامنے کھڑا ہوگیا اور کہا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے تجھے دونوں جہانوں کے لیے عبرت بنایا۔ اس نے دیکھا کہ حسین بن منصور اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے ہوئے کہہ رہا ہے۔ **اقتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم**

جب انہیں پھانسی دی گئی اور جلایا گیا اور دجلہ میں طغیانی آ گئی۔ حتیٰ کہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ بغداد غرق ہو جائے گا تو خلیفہ نے کہا کہ کیا تمہیں پتہ ہے کہ حلاج نے اس بارے میں کچھ کہا تھا۔ حاجب نے کہا ہاں امیرالمومنین اس نے اس طرح کہا تھا تب اس نے حکم دیا جیسا اس نے کہا تھا' ویسا ہی کرو۔ انہوں نے راکھ پانی میں پھینک دی تو پانی کی سطح پر وہ راکھ اس طرح اکٹھی ہوگئی کہ اللہ لکھا ہوا نظر آتا تھا اور پانی ساکن ہوگیا۔ یہ 309ھ کی بات ہے' واللہ الموفق۔

الفریڈ وان کریمر لکھتا ہے کہ اس امر پر کوئی اختلاف رائے نہیں کہ حلاج کے بے شمار پیروکار تھے جو اپنے مرشد کی بے حد عزت کرتے تھے اور ان کی ذات سے روحانی کرامات منسوب کرتے تھے اور راسخ الاعتقاد افراد نے اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے ڈر کر حکومت وقت پر زور دیا کہ اس کے خلاف مناسب اقدام کیے جائیں اور 922ء میں سخت تکالیف دینے کے بعد انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

پروفیسر نکلسن اپنی تصنیف "صوفیائے اسلام" (1914ء) میں لکھتے ہیں کہ دسویں صدی عیسوی کے آغاز میں (922ء) میں حلاج کو بغداد میں بڑے وحشیانہ طریق سے قتل کیا گیا اس کے قتل کی وجوہ زیادہ تر سیاسی تھیں۔

ماسینون لکھتا ہے کہ حلاج کو بنی مجاشع سے روابط کے باعث جوانی سے تامرگ تکالیف و آلام سے دوچار رکھ گیا۔ اگر حلاج واقعتاً" شرعی مجرم تھا تو اس پر

ظالمانہ اور سفاکانہ طرز عمل اور ان کے پیروکاروں کو چن چن کر قتل کرنا قابل غور بات ہے۔

مولانا روم کہتے ہیں کہ نااہل حکمران اقتدار میں آنے کے بعد ولیوں اور بزرگوں کو کیا نبیوں کو بھی قتل کروا دیتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ وہ قتیل سیاست تھا۔

آخر میں ہم حسین بن منصور کا وہ قول پیش کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی ذات کے بارہ میں طاسین النقطہ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ

> "ایک دنیا دار جو عالم ناسوت میں گرفتار ہے مجھے برا بھلا کہتا ہے۔ البتہ جو دائرہ ملکوت تک پہنچ جائے وہ میرا منکر نہیں ہوگا اور جس پر عالم جبروت کے اسرار کھل جائیں وہ مجھے ایک عالم ربانی کہے گا اس سے بھی اوپر ایک عالم ہے جسے عالم لاہوت کہتے ہیں اگر کسی کی رسائی وہاں تک ہو جائے تو اس پر میرا مقام کھل جاتا ہے لیکن وہاں وہ میرے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔"